اتفاقات

گیارہ دلچسپ و دل آویز، اخلاقی، اصلاحی اور معاشرتی

افسانوں کا سبق آموز مجموعہ

معہ مقدمہ

ادیب الملک عالیجناب حضرت مولانا خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرتؔ

مصنفہ و مؤلفہ

مرزا فدا علی خنجرؔ لکھنوی

کتاب منزل لاہور

شیخ نیاز احمد تاجر کتب و پبلشر نے انڈین پرنٹنگ ورکس کچہری روڈ لاہور
میں باہتمام لالہ نرائن داس کمار پرنٹر چھپوا کر کشمیری بازار سے شائع کیا۔

بار اوّل ۱۹۴۶ء

تعداد ۱۰۰۰

قیمت دو روپے آٹھ آنے

فہرست

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱	مقدمہ کتاب ۔ از جناب ادیب الملک خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت	۵
۲	التفاقات	۱۱
۳	تدبیر	۴۳
۴	ماتما	۶۳
۵	عید	۷۱
۶	کشتۂ ناکامی	۸۵
۷	وکیل کی بیوی	۱۰۱
۸	پالش والا	۱۲۳
۹	شرافت نفس	۱۳۹
۱۰	حسن سعاوت	۱۵۷
۱۱	ظریف ایڈیٹر	۱۸۷
۱۲	کایا پلٹ	۲۱۳

مقدمہ

ہر زبان کے علمِ ادب کا شمار محاکات کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اور بیان میں مزہ بھی اُسی سے آتا ہے شعراء اگر دو مصرعوں میں محاکات کا مختصر ذکر نہ کریں۔ تو اُن کا کلام بے ربط اور روکھا پھیکا ہو جاتا ہے اور اس میں وہ مزہ باقی نہیں رہتا جو مذاقِ سلیم کو محظوظ کر سکے شعرا اس کے کلام میں پورے پورے قصے تو دو مصرعوں میں آ نہیں سکتے لہذا اُن کی آسانی کے لئے صنعتِ تلمیح ایجاد ہوئی۔ تلمیح سے مراد یہ ہے کہ کلام میں ایسا لفظ لایا جائے جس سے کسی کو، کوئی مشہور قصہ یاد آجائے۔ جیسے اس شعر میں سے

گِرنا تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر — غالبؔ

اس شعر میں "برقِ تجلّی" اور "طُور" کے ذکر سے ہم کو حضرتِ موسیٰؑ کا قصہ یاد آجاتا ہے، حضرت ایک بار مدائن کی سرزمین پر اپنی بی بی کو ساتھ لئے ہوئے جا رہے تھے کہ ایک مرتبہ آگ کی ضرورت پیش آئی۔ وہ آگ کی تلاش میں پھر رہے تھے کہ کوہِ طور پر روشنی دکھائی

دی اور آپ کو خیال ہُوا کہ وہاں آگ ہو گی۔

جب آگے بڑھے تو وہ روشنی اور دور ہو گئی۔ اور آگے بڑھے کہ قریب پہنچ کے آگ لے لیں مگر وہ دور ہی ہوتی گئی۔ تب یہ حیران ہوئے اور غیب سے ندا آئی "اے موسیٰ! یہ وادیِ ایمن ہے تم آگ لینے آئے تھے، جاؤ، تم کو نبوت عطا کی جاتی ہے۔" یہ ڈر رہے پھر آواز آئی "ڈرو نہیں، میں تمہارا خدا ہوں۔ آج سے تمہیں جو کچھ کہنا ہُوا کرے، یہیں کوہِ طور پہ چلے آیا کرو۔" چنانچہ آپ کوہِ طور پہ خدا سے باتیں کیا کرتے تھے اور ایک درخت "شجرِ طور" سے جواب ملتا تھا۔ اسی سبب سے آپ کا لقب کلیم اللہ ہُوا۔

آپ کی امت نے آپ کو مجبور کیا کہ "ہم بھی خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں" آپ امت کے کچھ لوگوں کو ہمراہ لے کے طور پہ گئے۔ اور کہا "رب ارنی" جواب ملا "لن ترانی" جب بہت اصرار کیا تو ارشاد ہُوا "ہم اپنی تجلّی دکھاتے ہیں اگر تم دیکھ سکے تو دیدار سے مشرف کرینگے۔" اور فوراً ایک تجلّی چمکی جس کے جلال سے کوہِ طور جل گیا حضرت موسیٰؑ کی امت کے لوگ ہلاک ہو گئے اور جناب موسیٰؑ غش کھا کے گر پڑے۔ اتنے بڑے واقعہ کو شاعر نے "برقِ تجلّی" اور "طور" کہہ کے یاد دلا یا ہے۔

یہ سب محاکات ہیں۔ محاکات اس قدر ہر دلعزیز ہیں کہ اُن کے واقعات جھوٹے ہوں یا سچے۔ دونوں مزہ دیتے ہیں۔ فارسی میں شاہنامہ فردوسی۔ نلدمن۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد اور تمام قصص کی کتابیں دلچسپی سے دیکھی جاتی ہیں۔ اُردو میں ان کا آغاز داستانِ امیر حمزہ سے ہوتا ہے۔ اسکی ہزاروں جلدیں چھپ چھپ کے عالمِ اردو میں پھیل

گئیں۔ بوستانِ خیال کی آٹھ جلدیں مرتب ہوئیں اور اُن کے بیان کرنے کیلئے داستان گو مقرر ہوئے۔

داستان گوئی نے وہ زور پکڑا کہ گلی گلی کوچہ کوچہ داستان سرائی ہونے لگی۔ اس کے بعد جب لوگوں کا اس سے جی بھر گیا۔ تو "ناول" نے دنیا کے پردے پر قدم نانہ رکھا۔

ناول اور قصے میں یہ فرق تھا کہ قصے محیر العقول ہوتے تھے اور ناول میں ہی کچھ ہوتا تھا۔ جس کا ممکن ہونا ضروری ہو۔ ان وجوہ سے ناول کی رعنائی اور دلچسپی نے قصص سے زیادہ لطف دیا۔

اچھے ناول لکھنے والوں میں یہ وصف تھا۔ کہ وہ نتیجہ خیز اور سبق آموز ناول لکھتے تھے اور کسی نہ کسی مفید نصیحت پر ناول ختم ہوتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ناول کے ذریعے سے اردو زبان کی سچی خدمت بھی ہوتی تھی۔ جناب مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی نے اس اہم خدمت کو اپنے ذمے لیا تھا اور خدا جھوٹ نہ بلوائے انہوں نے دوسو سے زیادہ ناول تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیے اور اعلیٰ ناولسٹوں کی فہرست میں آپ کا نام جلی قلم سے لکھا گیا۔ آپ کے تمام ناول نتیجہ خیز اور پُر اثر ہوتے تھے جس کے سبب سے آپ کی شہرت عالمگیر ہو گئی اور بالاتفاق سب نے مان لیا کہ ناول کا پلاٹ ان سے بہتر کوئی ناولسٹ نہیں لکھ سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کے تمام ناول مقبولِ عام ہوئے اور ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

ابھی اسی خدمت میں مصروف تھے کہ آپ نے ملکی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے

معلوم کیا۔ کہ اب بہ نسبت ناول کے مختصر افسانے زیادہ مقبولِ عام ہیں۔ اس لئے آپ نے اپنے اشہبِ قلم کی باگ اسی طرف موڑ دی۔ اور تھوڑے زمانے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے افسانے لکھ ڈالے۔ جن کے مقاصد مختلف تھے۔ ان میں سے بعض افسانے ایسے تھے جو محض تعلیمِ نسواں سے تعلق رکھتے تھے اور اب آپ نے اس مقصد کے بہترین افسانے جمع کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو "اتفاقات" کے نام سے نامزد ہوا۔ اُمید ہے کہ یہ مجموعہ بھی ان کی دوسری تالیفات کی طرح مقبول ہوگا۔ اس بیان سے غرض یہ ہے کہ مولف زمانہ شناس ہیں اور ہمیشہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تالیفات میں تازگی اور دلچسپی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ کوئی حقیقت شناس تعلیمِ نسواں کی طرف متوجہ ہو اور اس ضرورت کے لئے بہترین افسانے لکھے۔

اخلاق کا درس اگر رُوکھا پھیکا ہو تو لوگوں کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ بلکہ محاکات سے وہی بات جو قصص کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ دُرِ گوشِ سامعین بن جاتا ہے اور لوگ اسے دل سے قبول کر لیتے ہیں۔ خاص کر نسوانی طبقے میں تو افسانہ بہت ہی عزیز ہے۔ بلکہ ہر طبقے میں اس کو عزت دی جاتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جتنی دلچسپی اُردو علم ادب نے پیدا کی ہے وہ سب محاکات۔ ناول اور افسانے کا طفیل ہے۔ اس کے سلئے ہیں اردو کے بہترین محاکات پرورش پائے۔ اسی کی بدولت زبانِ اُردو نے ترقی کی۔ الفاظ نے کثرت سے دخل حاصل کیا اور بہت جلد ترقی کر گئی۔ آج ہر ملک میں آپ کو جو اُردو داں

لوگ ملتے ہیں۔ ان کا سبب بھی قصص و ناول ہیں۔

ہندوستان میں جب پہلے پہل ناول نے اردو کا جامہ پہن کر قدم نازہ رکھا ہے تو اس کے رواج دینے والے دو چار اہل کمال تھے جن کی کوشش بار آور ہوئی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، بیکنٹھ باشی، مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم، حکیم محمد علی خاں طبیب مغفور یہی لوگ تھے۔ جنہوں نے اپنی عمریں اس خدمت میں صرف کر دیں اور اس نے زبان اور ملک کو کثیر فائدہ پہنچایا۔ یوں تو ہندوستان میں ہزاروں ناول نویس ہوئے اور ہیں لیکن مذکورہ بالا مصنفین نے اپنی زندگی اسی کام میں صرف کر دی۔ اگر ہم ایسی مثال پیش کرنا چاہیں۔ تو ہمیں صاف صاف کہنا پڑتا ہے کہ ایک شخص مرزا فدا علی خنجر سلمہ ہیں جن کی عمر عزیز کا سب سے بڑا حصہ اسی ناول نویسی اور افسانہ نگاری میں ختم ہو گیا۔ خدا ان کی عمر میں برکت دے اور یہ اپنے منصبی کام کو بوجوہ احسن انجام دیتے رہیں اور ملک میں کافی شہرت حاصل کرتے رہیں ؏

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

مورخہ یکم نومبر ۱۹۴۵ء۔ چہار شنبہ

اتفاقات

(۱)

مالک کوئی امیر نہ تھا۔ لیکن ورثے میں اتنی جائداد مل گئی تھی۔ کہ اس کی آمدنی سے سفید پوش شریفوں کی طرح اپنی اور اپنی جورو بچے کی پرورش کر سکے۔ وہ اپنے والدین کی تنہا اولاد تھا۔ اس کی والدہ تو جب ہی فوت ہو چکی تھی جن دنوں وہ میٹرک کے امتحان کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لیکن اس کے والد نے اُس وقت وفات پائی جب یونیورسٹی سے اس کو بی اے کی ڈگری حاصل ہوئی۔

یہ واقعہ المیانہ تھا۔ جو اُس کے ارادوں کے راستے میں روڑے نہ اٹکاتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مالک ہونہار نوجوان تھا اور شاید فطرت کو اس سے مفید کام لینا تھے کہ اس انقلاب پیدا کرنے والے حادثے نے اُس کے عزم میں کمزوری اور پائے استقلال

میں لغزش نہ ہونے دی۔ وہ غمی کے رسوم سے فارغ ہوتے ہی قانون پڑھنے اور وکالت پاس کرنے پہ آمادہ ہو گیا۔

ایک دن سہ پہر کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھا قانون کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اور اس کی بیوی (زہرہ) باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی کہ اس کا خورد سال بچہ (سلیم) کمرے کے سامنے والے صحن میں دوڑ دھوپ کرنے اور غل غپاڑہ مچانے لگا اس کے چیخنے چلانے اور دھپڑ دھپڑ دوڑنے سے مالک کا دھیان بٹنے لگا۔ اس نے دو چار مرتبہ چمکار چمکار کر منع کیا۔ بچہ تو بچہ۔ وہ کھیل کود کے سامنے کسی کی کب سنتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ مالک کو نیلی پیلی آنکھیں کر کے کئی بار گھرکنا پڑا۔ سلیم نے خفگی کی بھی پرواہ نہ کی تو مالک کو غصہ آ گیا۔ بچے سے تو کیا بولتا۔ بیوی کو پکار کر کہا۔

"وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ اپنے لاڈلے کو بلاؤ۔ اُس کے شور و غل سے یاد کیا ہوا سبق بھی بھولا جاتا ہوں۔"

خدا کے فضل سے گھر میں ماما نوکر تھی۔ مگر زہرہ کاہل نہ تھی۔ وہ پاؤں جوڑ کر بیٹھنا اور پلنگ کے پائے توڑنا پسند نہ کرتی تھی۔ گھر کا کام دھندا۔ پکانا ریندھنا۔ سینا پرونا خود ہی کرتی تھی اور ماما صرف ہاتھ بٹا لیتی تھی۔ اُس نے مالک کے کہنے سے دو چار دفعہ سلیم کو آواز دی۔ وہ اپنی دُھن میں بھرا تھا۔ ماں کے پکارنے کی سماعت نہ کی اور مالک نے جُز بُز ہو کر پھر اپنی بیوی کو پکارا۔ اس مرتبہ لہجہ ذرا ترش تھا۔ زہرہ نے چولھے کے پاس بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

" ماما سودا لینے بازار گئی ہے۔ پتیلی میں گوشت بھن رہا ہے۔ اگر اسے چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہونگی۔ تو بوٹیاں جل کر کوئلہ ہو جائیں گی اور رات کو تم کھاتے وقت تن بھُن کر و گے سلیم تو نا سمجھ ہے مانے گا نہیں۔ تم ہی تھوڑی دیر کو کتاب گردان دو گے تو کیا ہرج ہو جائے گا؟"

نہرو کسی کام کو شروع کر کے ادھورا چھوڑنا جانتی نہ تھی۔ اسکی اس جبلی عادت سے مالک اچھی طرح واقف تھا اپنی بات کا جواب سن کر بولا۔

" اگر تم چولھے کے پاس سے اُٹھنا نہیں چاہتیں تو نہ اُٹھو۔ میں ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ پارک میں بنچ پر بیٹھ کر سبق خوب یاد ہوتا ہے۔

(۲)

آفتاب غروب ہونے کے قریب تھا۔ اُسکے قرص کا نصف اور لال بھبوکا رنگ غربی سمت والے درختوں کی پھُننگیوں پر نظر آرہا تھا۔ مختلف رنگوں نے نمودار ہو کر اُس کے چاروں جانب آسمان پر مینا کاری کر دی تھی۔ جس کا نظارہ فرحت اور انبساط سے خالی نہ تھا۔ مالک ٹھیک اسی وقت خاکی کرتا پہنے ہوئے، ننگے سر اور کتاب ہاتھ میں لئے پارک پہنچا۔ پارک اُسکے مکان کے سامنے ہی تھا۔ اس لئے یہاں آنے میں کسی تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ جب دم گھبرایا جس طرح گھر میں بیٹھا ہے۔ اُسی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ٹہلتا ہوا پارک جا پہنچا۔ فوارے کے سامنے پھولوں کا کنج تھا۔ اسکے اندر آہنی بنچ پڑی رہتی تھی۔ مالک یہیں ہر قسم کے شور و شغب سے بیگکر اطمینان اور یکسوئی قلب سے درسی

کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ اس عمل کی اتنی مزاولت ہوتی تھی کہ پارک میں آنے والوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا اور انہوں نے اُس کنج کو مالک کے واسطے مخصوص کر دیا تھا۔ پارک کے ایک پہلو میں فٹ بال، ہاکی اور ٹینس کھیلنے کے گراونڈ تھے۔ جہاں کھیل کی مختلف ٹیمیں کھیل کی مشق کیا کرتی تھیں۔ مالک ان شغلوں سے بہت کم اور شاذ و نادر دلچسپی لیتا تھا۔ اُسے اپنا سبق یاد کرنے سے بالکل فرصت نہ ملتی تھی کہ ان ورزشی کھیلوں کی طرف متوجہ ہو سکتا۔ جو وقت ان کھیلوں کے واسطے مقرر ہے۔ یہی ساعت اُس کے پڑھنے کی تھی۔ اُس کے بیٹھکے میں روزانہ دس بجے رات تک دوست احباب خوش گپیوں میں مشغول رہتے تھے۔ اور اسکے بعد ہی آرام کرنے کی گھڑی آجاتی تھی۔

آج کا سبق کسی قدر مشکل تھا۔ اس لئے دیر تک پارک میں بیٹھنا پڑا جب کنج کے اندر بالکل اندھیرا ہو گیا۔ تو وہاں سے اُٹھ کر لالٹین کے کھمبے کے قریب والی بنچ پر جا بیٹھا۔ اور روشنی میں پڑھنے لگا۔ قریب کے گھنٹہ گھر نے سات بجائے۔ فٹ بال۔ ہاکی اور ٹینس کھیلنے والی ٹیمیں اپنا اپنا کھیل ختم کر کے پارک سے چلی گئیں۔ پہلے ساڑھے سات کا آدھا اور پھر آٹھ بجے۔ جب کہیں خدا خدا کر کے سبق یاد ہوا اور کتاب گردانی گئی۔ بھوک کے مارے پیٹ میں سب آنتیں قلابازیاں کھا رہی تھیں۔ دوپہر تک پڑھتے رہنے سے سر بھاری ہو گیا تھا۔ وہ انگڑائی لیتا اور ہاتھوں کی انگلیاں چٹکاتا ہوا اُٹھا اور ٹینس کے گراونڈ کی طرف ہوتا ہوا مکان کو چلا اس وقت نرم نرم دوب پہ چلنا بہت بھلا معلوم ہوا۔ اُس نے سرخی کی ہوئی سڑک چھوڑ کر سبزے پر قدم رکھنا شروع کیا۔ اس پانچ گام چلنے

کے بعد ٹھوکر لگی اور کوئی کالی کالی چیز اچھل کر دو تین فٹ پر جا گری۔ اُس کے گرنے کی خفیف سی صدا نے مالک کو چونکا سا دیا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پھر آگے بڑھا اور جھک کر اُس سیاہ چیز کو اُٹھا لیا۔ یہ ایک منی بیگ تھا۔ شاید فٹ بال یا ٹینس کھیلنے والوں یا تماشائیوں میں سے کسی کی جیب سے نکل کر گر پڑا تھا۔ مالک نے چاروں طرف گشتی نظر دوڑا کے دیکھا کہ شاید کوئی موجود ہو تو اُس سے دریافت کرے مگر سارا پارک مایوس دل کی طرح خالی اور سنسان پڑا تھا جب کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ تو تھوڑی دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا" نہ جانے کس کا بیگ ہے اور اُس تک کیونکر پہنچایا جا سکتا ہے؟ اگر بے سمجھے بوجھے کسی کے حوالے کر دیا جائے تو رقم تلف ہونے اور اصلی مالک تک نہ پہنچنے کا احتمال ہے۔ آخر اُس نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ تھانے چل کر پولیس کو سونپ دینا چاہیے۔ جس کا منی بیگ ہوگا۔ پولیس تلاش کر کے اُس کے حوالے کر دیگی اور میں آخرت کے مواخذہ سے بچ جاؤنگا۔

اس موقعہ پر دو سبب تھانے جانے سے عناں گیر ہوئے۔ اول تو گلے میں خالی کرتا تھا۔ شیروانی اور سر پر ٹوپی ندارد تھی۔ دوسرے بھوک کی وجہ سے بڑی آنتیں چھوٹی آنتوں کو کھائے جاتی تھیں۔ رات کے آٹھ بھی بج چکے تھے۔ اس نے خیال کیا" پولیس بھی اس وقت منی بیگ کے مالک کا پتہ لگانے کی زحمت گوارا نہ کر کے اُس کو اپنی تحویل میں جمع کر لے گی۔ پھر اگر یہ امانت رات کی رات میرے ہی گھر میں رہے تو کیا مضائقہ ہے صبح تڑکے چوکی میں جا کے دے آؤنگا۔ یہ آخری فیصلہ تھا جو عقل کی عدالت نے صادر کیا۔

اس نے منی بیگ کرتے کی جیب میں رکھ لیا اور قدم بڑھاتے ہوئے مکان پر پہنچا۔

(۳)

بیٹھکے میں لیمپ روشن تھا لیکن احباب میں سے کوئی نہ تھا یا تو کچھ لوگ آ کے واپس چلے گئے تھے۔ یا مالک کی طرح انہیں بھی کسی سبب سے دیر ہو گئی ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔ احباب کی غیر حاضری سے مالک کو خوشی ہی ہوئی۔ کیونکہ اب اطمینان سے کھانا کھانے کا موقعہ مل گیا ورنہ بعض بے تکلف دوست تو ایسے ہیں جن کی تعجیل سے منہ تک نوالہ جانا مشکل ہو جاتا ہے۔

مالک اندر پہنچا تو معمول کے خلاف سلیم کو جاگتا ہوا پایا۔ وہ عموماً چراغ میں بتی پڑتے ہی سو جایا کرتا تھا۔ اُس نے کسی قدر متعجب ہو کر بیوی سے پوچھا۔

"آج یہ نئی بات کیسی؟ سلیم کو تو اب تک سو جانا چاہیئے تھا۔"

زہرہ۔ تمہارے جانے کے بعد وہ کھیلتے کھیلتے میرے پاس آیا اور گود میں لیٹ کے آرام کیا۔ جب کا سوتا سوتا ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ اٹھا ہے۔

مالک۔ یہ جو سبھی آنکھیں دھوئی دھلائی صاف ہیں۔ اب تو یہ رات گئے تک جاگیں گے۔ میرا تو بھوک کے مارے قُل ہوا جاتا ہے۔ جلدی دسترخوان بچھاؤ۔ باہر کوئی آ گیا تو پھر کھانا کھانا دشوار ہو جائے گا۔

زہرہ اُٹھ کر باورچی خانے گئی۔ ماما نے برتن سامنے رکھے۔ سینی میں کھانا نکل کے آیا۔ دسترخوان چنا گیا اور میاں بیوی کھانے بیٹھے۔ سلیم نے بھی دونوں کا ساتھ دیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ بھی نہ دھوئے تھے کہ باہر سے طلبی ہوئی۔ خواجہ علیم اللہ آئے تھے۔ یہ مالک کے جگری دوست تھے۔ اگرچہ مالک کا کوئی حقیقی بھائی نہ تھا مگر وہ علیم اللہ کو سگا بھائی تصوّر کرتا تھا۔ اس نے خبر پاتے ہی جلد جلد ہاتھ دھوئے۔ تہ آبخورے سے پان منہ کے ایک گلوری گلے میں اور ایک ہاتھ میں لئے باہر آیا۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد پوچھا۔

تم تو بڑی سختی سے وقت اور وضع کی پابندی کرتے ہو۔ پھر آج دیر ہونے کی کیا وجہ ہے؟

علیم:- کیا بتاؤں معمول کے خلاف کچھ ایسی باتیں پیدا ہو گئیں کہ لاکھ لاکھ کوشش کرنے پر بھی تاخیر ہو گئی۔ مجھے تو ڈر تھا کہ آج ناغہ نہ ہو جائے۔ مگر ایک ضروری کام میں تمہاری مدد کی ضرورت آپڑی اور میں منہ اٹھائے سیدھا یہاں چلا آیا!

مالک:- خیریت تو ہے؟

علیم:- خیریت ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ نعیم خالو اچانک چلے آئے اور بیان کیا کہ ہم لوگ بیت اللہ شریف جا رہے ہیں اور اب ہندوستان واپس آنے کا خیال نہیں ہے۔ علیم کی خالہ تم لوگوں سے ملنا اور رخصت ہونا چاہتی ہیں۔ ان کے اور سب عزیز تو ان کے پاس موجود ہیں۔ صرف تم ہی لوگ نہیں ہو۔ مجھے بھیجا ہے کہ تم لوگوں کو بلا لے آؤں۔ تم کہو، بھلا میں کیوں کر جاؤں؟ کہیں اتنا جلد ہاتھوں پر سرسوں جمائی جا سکتی ہے لیکن والدہ بالکل تیار ہیں۔ سفر کا سامان درست کر رہی ہیں۔ اور نہیں روپے

کے واسطے سٹپٹاتا پھرتا ہوں۔

علیم اللہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اندر سے ماما گھبرائی ہوئی آئی اور مالک سے نفرت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

"میاں! خدا کے لئے جلدی اندر چل کے دیکھئے تو سہی کیا اندھیر ہوگیا؟ صاحبزادے کھیلتے کھیلتے تختوں کے چوکے سے گر پڑے سر پھٹ گیا۔ گھاؤ سے اتنا خون بہا کہ بچے کا سارا کرتہ لہولہان ہوگیا۔ ان کے دشمن وہی بیہوش پڑے ہیں۔ میں نگوڑی تو اس وقت وہاں سے اچٹ گئی تھی۔ موجود ہوتی تو یہ قیامت ہی کیوں برپا ہوتی۔ بیگم صاحبہ کتاب پڑھنے میں مشغول رہیں اور صاحبزادے کی لال لال لعل ہی جان پر بن گئی!

ماما کے بیان کرنے سے مالک ایسا گھبرایا کہ علیم اللہ کو جواب بھی نہ دے سکا۔ مضطرب اور سراسیمہ زنانے مکان میں چلا گیا۔ گھبرا کے اٹھنے سے کچھ اس عنوان سے دامن کو جنبش ہوئی کہ کرتے کی جیب سے منی بیگ نکل کر وہیں گر گیا۔ علیم اللہ نے اسے اٹھا کر دیکھا تو سو سو کے دو نمبری نوٹ، پانچ روپے نقد اور دس بارہ آنے کی ریزگاری برآمد ہوئی۔ اسے تو روپے کی ضرورت تھی ہی اور مالک سے تکلف بھی نہ تھا۔ اس لئے دونوں نمبری نوٹ نکال کر احتیاط سے جیب میں رکھے اور مالک کی اطلاع کے لئے سادے کاغذ پر چند سطریں تحریر کیں اور اس کاغذ کو نوٹوں کے بدلے منی بیگ میں رکھ کر اپنے گھر واپس گیا۔

ان پڑھ عورتوں کو واقعہ رنگنے اور مبالغہ کرنے کی خوب مہارت ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑھا کر بتنگڑ بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ماما نے بھی نسوانی فطرت کے مطابق سلیم کے گرنے کو خاص انداز سے بیان کیا تھا۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ وہ تختوں کے چوکے پر کھیل رہا تھا۔ زہرہ کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی کہ اس کا پاؤں کرتے کے دامن میں الجھا اور وہ لڑکھڑا کے تخت کے نیچے جا رہا۔ دروازے کی رگڑ سے ذرا سا ماتھا چھل گیا اور خون چھلک آیا۔ ادھر تو ماں اپنی مامتا سے پھڑپھڑا کر "اے ہے میرا بچہ" بلکتی ہوئی اٹھی۔ ادھر بچہ سہم کر چپ ہو گیا۔ بس اتنی سی بات ماما کے طومار باندھنے کو کافی ہو گئی اور اس نے جن لفظوں میں واقعہ کا اعادہ کیا وہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

مالک جب زنان خانے میں پہنچا تو اصلیت معلوم ہوئی۔ دل ٹھکانے ہوا۔ اس نے لاحول پڑھتے ہوئے سلیم کا ماتھا دیکھا۔ چھلی ہوئی جگہ پر کتھے کا لیپ کرایا اور کھلونے لا دینے کا خوشگوار وعدہ کر کے بچے کو بہلا پھسلا دیا۔ جب سلیم پھر بھولی بھالی اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا تو وہاں سے اٹھ کر بیٹھکے میں آیا۔ بیٹھکہ خالی اور علیم اللہ کو غیر حاضر پا کر سمجھا کہ "شاید اپنے خالو کے خیال سے چلا گیا ہوگا" چونکہ ابھی نو نہیں بجے تھے اور وہ ہمیشہ دس بجے سویا کرتا تھا۔ اس لئے وقت گزاری کے خیال سے اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ اسے فرقہ بندیوں سے دلی تنفر تھا اور ہندوستان میں بسنے والی قوموں کو ٹھیٹھ ہندوستانی خیال کرتا تھا۔ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، یہودی ہوں یا پارسی۔ اس کے نزدیک سب قوموں کے اغراض و مقاصد ایک ہیں۔ معاشرت اور تمدن متفق ہونا

چاہیئے تھا۔ مگر ہندوستان کی فضا پر تعصبات کے گہرے گہرے بادل چھائے ہیں۔ اور ان سے جو زہر برس رہا ہے۔ اُس کی بوچھاڑ اخبار کے کالموں پر دکھائی دیتی ہے۔ مالک، ان افسوسناک خبروں کو عبرت کی نگاہوں سے پڑھتا۔ اور دل ہی دل میں متاسف ہوا کرتا تھا۔ آج کا اخبار بھی کچھ ایسی ہی اطلاعوں سے مملو تھا۔ اُس کا جی نہ لگا۔ اخبار ہاتھ سے رکھ کے ایک ادبی رسالہ پڑھنا چاہا یکایک منی بیگ کا خیال آگیا جیب ٹٹولی۔ تو وہاں میدان صاف تھا جی سن سے ہو گیا۔ اس کا ذاتی نقصان ہوا ہوتا تو اتنی فکر نہ ہوتی جتنا پرائی چیز جانے کا قلق ہوا۔ اُس کے ضمیر نے خود اسی کو مجرم ٹھہرایا۔ اگر وہ اسی وقت جو کی میں جا کے منی بیگ دے آتا تو یہ سانحہ پیش نہ آتا۔ تھوڑی دیر چپ بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر بیٹھکے میں ادھر اُدھر ڈھونڈھنے لگا۔ علیم اللہ منی بیگ سامنے ہی رکھ گیا تھا کہ مالک کو تلاش کرنے کی زحمت نہ ہو۔ پہلی ہی نظر میں مالک نے دیکھ لیا اور خوش ہو کے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ابھی تک اُسے کھولنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اُس نے یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے اس میں کوئی ایسا کاغذ نکل آئے جس کے ذریعہ سے اصلی مالک کا سراغ مل سکے منی بیگ کھول کر جائزہ لینا شروع کیا۔ پانچ روپے۔ دس بارہ آنے کی ریزگاری اور علیم اللہ کا رقعہ ملا۔ اُس نے رقعہ کھول کر پڑھا۔ پڑھتے ہی "نہ پر ہوا ئیاں چھوٹنے لگیں۔ آنکھوں سے فکر و تشویش نمایاں ہو گئی اور وہ پیکر تصویر بن کے رہ گیا۔ علیم اللہ نے لکھا تھا۔

"مجھے سفر کے واسطے دو سو روپے کی ضرورت تھی۔ تم سے ایک ہفتے کے وعدے پر قرض لینے آیا تھا۔ وہاں سے واپس آ کے اپنی تنخواہ وصول کروں گا اور سب سے پہلے

تمہاری واجب الادا رقم بیباق کروں گا۔ مجھے یقین تھا کہ تم اس معمولی رقم کے دینے سے پہلوتہی نہ کروگے۔ مگر اس مطلب کے کہنے کی نوبت نہ آئی کہ تم کو پاس سے اٹھ جانا پڑا۔ جاتے وقت تمہاری جیب سے منی بیگ گر پڑا میں نے اپنی خوش نصیبی خیال کرکے اس میں سے دو نمبری نوٹ نکال لیے اور تمہاری آگاہی کے واسطے یہ رقعہ رکھ دیا ہے۔ چونکہ دس بجے کی ٹرین سے روانہ ہونے والا ہوں۔ اس لیے یہاں ٹھہر کے تمہاری واپسی کا انتظار نہیں کرسکتا۔ مجھے اپنی اس حرکت پر عذر و معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جہاں مغائرت ہوتی ہے وہاں ایسے تکلفات برتے جاتے ہیں۔ امید ہے۔ برخوردار کے زیادہ چوٹ نہ آئی ہوگی اور اس معمولی بات کو اتنی اہمیت دینا تمہاری جاہل ماما کی شاعری ہوگی۔ خدا حافظ۔

ملک رقعہ کا مضمون پڑھ کے سناٹے میں آگیا۔ اسے پرائی رقم پر تصرف کرنے اور قرض دینے کا حق نہ تھا خصوصاً اس حالت میں جبکہ وہ ایسے عنوان سے ہاتھ لگی ہو۔ جس کا روپیہ ہے نہ معلیم اس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ کسی کا ایک پیسہ گر جاتا ہے۔ تو رنج ہوتا ہے نہ کہ دوسو پانچ روپے اور کچھ آنے۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ اس نقصان کی بدولت اس کی کیسی کیسی ضرورتیں اٹک گئی ہوں گی؟ وہ آدھے گھنٹے تک انہیں باتوں پر غور کرتا رہا۔ پھر علیم اللہ کے گھر جانے اور رقم واپس لانے کا ارادہ کیا لیکن فطری مروّت مانع ہوئی۔ ہرچند وہ دولتمند نہ تھا لیکن اپنی مالی حالت ظاہر کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ احباب کے حلقے میں اپنے آپ کو لیے دیئے رہتا تھا۔ اس کے دوست اُسے روپے والا سمجھتے تھے۔

کیونکہ وہ گاہ بگاہ ان کی امداد و استعانت کیا کرتا تھا۔ رات برات جب کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ مالک کے پاس دوڑا آتا تھا اور مالک بھی اُن کی خواہش کے موافق دس پانچ دن کے وعدے پر روپیہ قرض دے دیتا تھا۔ اس لین دین کی وجہ سے کبھی کبھی خود اُسے تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ مگر وہ اپنی اخلاقی کمزوری سے مجبور تھا۔ زہرہ ہمیشہ ان امور کی مخالف رہتی تھی۔ دو تین دفعہ لڑی جھگڑی بھی مگر مالک نے کچھ خیال نہ کیا۔ البتہ آج کے واقعہ نے اُس کے دل کو بڑی اذیت پہنچائی۔ کئی مرتبہ شیروانی پہن کے علیم اللہ کے یہاں جانے کو تیار ہوا لیکن مروت اور گھڑی میں پونے دس بجے ہونے کی وجہ سے ہر دفعہ وہ ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ علیم اللہ نے دس بجے کی ٹرین سے روانہ ہونے کی اطلاع دی تھی۔ اس لئے مکان پر ملنا خلاف عقل تھا۔ اسٹیشن پر موجود ہونے کی امید تھی۔ لیکن اس کے مکان سے اسٹیشن اتنے فاصلے پر تھا کہ تیز سے تیز سواری بھی پندرہ منٹ میں نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اور اگر جہالت کر کے چلا بھی جائے تو جب اسٹیشن پہنچے گا۔ تو علیم اللہ کی ٹرین پلیٹ فارم سے نہ معلوم کتنی دور ہو چکی ہو گی۔ مجبوری کا نام شکریہ ہے۔ اس نے اپنے اوپر غصہ پیا کر کے آٹھ دس دن صبر کرنا طے کیا۔ خود اس کی تحویل میں اتنی رقم تھی جو روز کے اخراجات سے بچا کے دو سو روپے ادا کر سکتا۔

(۵)

اس واقعہ کو ایک ہفتہ ہو گیا۔ مالک نے یہ آٹھ روز بڑی بے چینی میں گذارے۔ علیم اللہ کے وعدے کا ایک ایک دن گنا۔ قانون پڑھنے میں بالکل دلچسپی نہ رہی۔ ادھر

کتاب کھولی اور اس کے ورقوں پر سنیما کی متحرک تصویروں کی طرح گذری ہوئی باتوں کے نقشے نمودار ہو گئے۔ سلیم کا غل مچانا۔ اپنا خفا ہونا پھر پارک جانا۔ واپس ہوتے وقت منی بیگ ملنا یا منی بیگ کے مالک کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی۔ اس کا حزن وملال دیکھ کر دل لہو ہو جاتا۔ یونہی آٹھ روز بسر ہوئے۔

آٹھویں روز سے پورا یقین تھا کہ سلیم اللہ بمبئی سے واپس آ گیا ہوگا اور وعدے کے مطابق دو سو روپے کر رات کو یہاں ضرور آئے گا۔ انتظار کی ساعتیں کٹھن ہوتی ہیں۔ خصوصاً اس وقت ان کی سختی اور بڑھ جاتی ہے جب انتظار کا زمانہ ختم ہونے والا ہوتا ہے۔ اسے علیم اللہ کی واپسی کا یقین ہو چکا تھا۔ اس لئے آج کا دن پہاڑ ہو گیا تھا کسی طرح کاٹے سے نہیں کٹتا تھا۔ روز کا پروگرام ختم ہو گیا دن ڈھلا شام ہوئی چراغ جلے اور اس پر خیالات کا ہجوم ہوا۔ اس نے سوچا :-

"علیم اللہ آئے گا تو میں اسے اس بیہودہ حرکت پر خوب آڑے ہاتھوں لوں گا۔ وہ شرمندہ ہو کے معذرت کرے گا۔ پھر ہم دونوں اسی وقت پولیس اسٹیشن جا کے روپیہ جمع کر دیں گے۔"

پھر خود ہی خیال کرتا کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب اسے محجوب کرنے سے کیا فائدہ؟ غالب نے خوب کہا ہے ؎

سفینہ جبکہ کنارے پر آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

خیالات کے استغراق نے وقت کا احساس نہ ہونے دیا۔ آٹھ بج گئے۔ کھانے کا وقت گذر گیا اور اُس کا سر زانو پر دھرا رہا۔ زہرہ نے کچھ دیر انتظار کر کے ماما کو بلانے بھیجا۔ اُس کے پکارنے سے مالک کو ہوش آیا۔ اُٹھا ——— اور اپنی خود رفتگی پر نادم کھانا ہوا اندر گیا۔ دسترخوان بچھا تھا۔ زہرہ کے خیال سے ہاتھ دھو کے کھانے بیٹھا تو سہی لیکن فکر کے مارے کچھ کھایا نہ گیا۔ علیم اللہ کے نہ آنے سے طرح طرح کے توہمات گھیرے تھے۔ کھانے سے فراغت کرتے ہی پھر بیٹھک میں جا بیٹھا۔ اور پورے گیارہ بجے رات تک اس کا منتظر رہا۔ مگر علیم اللہ نہ علیم اللہ کوئی اور دوست بھی جھانکنے نہ آیا۔ اُدھر گھڑیال نے گیارہ بجائے۔ اُدھر اسے علیم اللہ کے آنے سے یاس ہو گئی۔ مغموم اور محزون اٹھا۔ بیٹھک بند کیا اور اندر آکر اپنے بستر پر لیٹ رہا۔

چند روز سے زہرہ اُسے چپ چاپ، اداس اداس دیکھ کر دل ہی دل میں اس تغیر کا سبب دریافت کر رہی تھی۔ لاکھ لاکھ غور کرتی تھی مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ بجائے خود اس خیال سے ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مجھ سے نادانستہ کوئی قصور ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کے دشمنوں کا مزاج مکدر رہتا ہے۔ مگر جہاں تک غور کرتی تھی اپنی اطاعت اور خدمت میں بال برابر فرق نہ پاتی تھی۔ جب آٹھ دس دن کے سوچ بچار میں کوئی بات ذہن نشین نہ ہوئی۔ تو تنگ ہو کر پوچھ بیٹھی۔

"کیا تمہارے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے؟ دیکھتی ہوں پورے ایک اٹھوارے سے سست رہتے ہو۔ اسلیم تمنا کا کرنا ہے تم اس سے بھی ملتفت نہیں ہوتے۔ خدا نہ

کرے مریضوں کا جی اندر سے برا رہتا ہو تو حکیم کو نبض دکھاؤ۔ خدا نے چاہا تو دو چار نسخوں میں فائدہ ہو جائے گا۔ عارضے سے غفلت کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ آگے تم جانو میری سمجھ میں جو تھا کہہ دیا۔

مالک ٹھنڈی سانس لے کر جواب سوچنے لگا۔ لمحہ بھر توقف کر کے ساری کیفیت بیان کر دی۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا اس موقعہ پر کونسا طریقہ اختیار کروں؟ میری جتنی آمدنی ہے وہ تم سے چھپی نہیں ہے۔ خدا جانے گھر کا خرچ ہی کیونکر نبھتا ہے۔ پھر وہ سو فاضل کہاں سے آئیں جو پرائے دین سے ادا ہوں۔"

زہرہ۔ یہ ایسا دین کیسا؟ تم کو تو یہ رقم پڑی ملی ہے۔ یہ نہ تو چوری کہلائیگی نہ سینہ زوری۔ میں تو سمجھتی ہوں۔ خدا نے ترس کھا کر میرے نصیب سے تم کو دیا ہے۔ سلیم کے ہاتھ پاؤں میں گھنگرو نہیں ہیں۔ اللہ رکھے مٹر مٹر چلتا ہے۔ گھنگرو ہوتے تو چھن چھن بولتے۔ وہ خوش ہوتا اور میرا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو جاتا مگر تمہارا ہاتھ تنگ دیکھ کر زبان سے نہیں نکال سکتی تھی۔ سوچتی تھی جب تم امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دو گے۔ تو بنوا لوں گی۔

مالک۔ تمہارا خیال غلط ہے۔ یہ سمجھ کر پرایا مال اٹھا لینا کہ خدا نے فلاں کی تقدیر سے دیا ہے۔ بالکل مہمل ہے۔ صاحبِ مال کو تلاش کرنا ہمارا فرض ہے۔ جب تک تمام شرعی تحقیقیں ختم نہ ہو لیں۔ اُس رقم پر تصرف کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

زہرہ۔ پھر شرعی تحقیقیں کیونکر تمام ہوں گی؟

مالک۔ اس طرح کہ یہ روپے پولیس کے پاس امانت رکھ دیں اور اخباروں میں اعلان چھپوا دیں، جس کا مال ہوگا وہ منظر نے جا کے اپنا حق ثابت کرے گا اگر پولیس کے نزدیک اُس کے پیش کیے ہوئے ثبوت قبول کرنے کے قابل ہوں گے تو روپئے بیگ اُس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

زہرہ۔ پھوپھی کی رقم۔

مالک۔ میں تو اس تدبیر پر مدت کا عمل کر چکا ہوتا۔ مگر علیم اللہ کی بدولت سب منصوبے خاک میں مل کے رہ گئے۔

زہرہ۔ اب تو علیم اللہ بمبئی سے آگئے ہوں گے۔ وہاں جا کے سب حال بیان کر دو۔ وہ ایسے آدمی نہیں جو آنا کانی کریں۔

"ہاں، کل صبح جاؤں گا" کہہ کر مالک نے کروٹ لی اور اپنے آپ کو نیند میں ڈال دیا۔

(۷)

مالک دوسرے دن علی الصباح علیم اللہ کے مکان روانہ ہوا۔ راستے بھر طرح طرح کے خیالات پریشان کرتے رہے۔ قدم قدم پر مروت نے روکا۔ غیرت نے دامن پکڑا۔ اور دم چلتے چلتے رک گیا سوچا ——— منہ اندھیرے آنے سے علیم اللہ اپنے دل میں کیا سمجھے گا۔ عجب نہیں جو بے صبری کا الزام دے اور یہ غلط بھی نہ ہوگا۔ اُس کی مالی حالت مجھ سے بہت اچھی ہے۔ خدا کے افضال سے تین سو کا نوکر ہے۔ تنخواہ کے علاوہ جائداد کی آمدنی ہے۔ میرا تو صرف بھرم ہی بھرم ہے۔ اُس کے سامنے میری

زبان سے روپے کا نام نہیں نکل سکتا۔ دریافت کرنے پر کہہ دوں گا ”تم سے ملنے آیا ہوں“۔ یہ فقرہ نامناسب بھی نہ ہوگا۔ مگر توبہ! حقیقت بھی کہیں چھپ سکتی ہے بس لاکھ حیلہ حوالہ کروں وہ صورت دیکھتے ہی تاڑ جائے گا۔ شاید روپیہ دینے کے بعد دبی زبان میں اس گھبراہٹ اور جلد بازی کی شکایت بھی کرے۔ اُف! آخر میں معذرت کر لوں گا سنجیدہ آدمی ہے۔ معقول عذر سن کر صاف ہو جائے گا۔ وہ دل ہی دل میں گھٹتا گھٹتا علیم اللہ کے گھر تک پہنچ گیا۔ دروازے پر دربان میٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مالک کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ قریب جا کے علیم اللہ کو دریافت کرتا۔ ناچار دروازے کے قریب پہنچ کر کنائی کاٹنا پڑی۔ دربان کو کنکھیوں سے دیکھتا آگے بڑھا چلا گیا۔ ضرورت بری بلا ہے۔ سو پچاس قدم چل کر پھر پلٹنا پڑا۔ یونہیں چند پھیرے ہوئے۔ آخر جی کڑا کر کے رکتا ٹھٹکتا اور ہچکچاتا ہوا پھاٹک میں داخل ہوا۔ علیم اللہ کے پاس آنے جاتے رہنے سے دربان پہچانتا تھا۔ دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ سلام کر کے آنے کی وجہ پوچھی۔ مالک نے علیم اللہ کو دریافت کیا۔ اس کا جواب امید شکن ملا۔ دربان نے بیان کیا ”جب سے وہ تشریف لے گئے ہیں۔ اس وقت تک کوئی خط پتر نہیں آیا ہے“۔ اس اطلاع نے مالک کے رہے سہے حواس بھی غائب کر دیئے۔ مایوسی کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ علیم اللہ سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ عہد شکنی کرے گا۔ ضرور کوئی نہ کوئی بکھیڑا پڑا ہے۔ عجب نہیں جو اس کی خالہ نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا ہو اور اس نے مجبوراً منظور کر لیا۔ تین مہینوں کی تو بات ہے۔ اس عرصہ میں حج کی رسمیں ادا کر کے ہندوستان

واپس آجائے گا۔ جوں جوں خیالات وسیع ہوتے جاتے تھے ہمتیں ٹوٹتی جاتی تھیں۔ کئی منٹ تک بُت بنا کھڑا رہا۔ آخر کرتا تو کیا کرتا، مغموم اور محزون مکان واپس آیا۔ طبیعت پریشان تھی گھر میں ٹکا نہ گیا۔ پارک چلا گیا اور دس بجے کے بعد تک کنج میں بیٹھا رہا۔ جب دھوپ تیز ہوئی تو واپس آیا۔ بیٹھک کے فرش پر ایک لفافہ پڑا تھا۔ شاید اس کی عدم موجودگی میں ڈاکیہ ڈال گیا ہوگا۔ اٹھا کر دیکھا۔ انگریزی میں اس کا نام اور پتہ تحریر تھا۔ اسٹامپ پر ڈاک خانے کی مہر چھپی تھی۔ اگرچہ سب حروف ابھرے نہ تھے۔ مگر بمبئی صاف پڑھا جاتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ علیم اللہ نے خط بھیجا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے مردہ امیدوں میں جان سی پیدا ہوگئی۔ خیال گذرا۔ "عجب نہیں جو دو سو کے نوٹ ہوں۔" اس کا یہ خیال بھی دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ بہت جلد امیدیں یاس سے بدلنا شروع ہو گئیں۔ دفعتہً ایک تردیدی خیال پیدا ہوا۔ "اگر لفافہ میں نوٹ ملفوف ہوتے تو احتیاطاً رجسٹری کیا جاتا۔" دل کی ساری تازگی بجلی کی چمک کی طرح غائب ہوگئی۔ اس نے مایوسانہ انداز سے تیزی چاک کر کے خط نکالا۔ القاب اور آداب کے بعد لکھا تھا۔

"خالہ جان بضد ہیں کہ والدہ اور میں ان کے ہمراہ حج کو چلوں۔ نیک کام سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خالو نے روپے کا انتظام کر کے رخصت بھی منظور کرا لی ہے اب ہم لوگ کل صبح کو مکے شریف روانہ ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ تین مہینے کے بعد واپس آکر تمہارا روپیہ دوں گا۔ اطمینان رکھو۔"

مالک کا سر گھومنے لگا۔ نگاہوں میں مستقبل کا ہولناک نقشہ پھر گیا۔ دکھے ہوئے

دل کی فریادیں رنگ لائے بغیر نہیں رہتیں جس غریب کا روپیہ گیا ہے اُس کی آہ چین نہ
لینے دے گی۔ نور دین تو جس طرح بنا صبر سے کام لیا تین مہینے تک سکوت اختیار کرنا
اور برابر روپیہ دبائے بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے علیم اللہ نے تین مہینے میں آنے کو
لکھا ہے لیکن اُس کی خالہ مستقل سکونت کی نیت سے گئی ہیں جس طرح انہوں نے
ہندوستان سے حجاز چلنے پر مجبور کر دیا تھا اُسی طرح وہاں کے قیام پر بھی راضی کر سکتی
ہیں۔ اس معاملے میں مجھے چپ نہ رہنا چاہیئے۔ اپنا انتظام واجب ہے۔ وہ بڑی دیر
تک فکر کے دریا میں ڈوبا رہا۔ ہزاروں تدبیریں ذہن میں آئیں لیکن کوئی صورت ثابت نہ
ہوئی۔ بیوی کا جہیز بیچ کر اس سے بہت زیادہ روپیہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس عنوان
سے روپیہ حاصل کرنے پر اس کی غیرت راضی نہ ہوئی۔ غور کرتے کرتے تھک گیا اور وہ
اس طرف سے خیال ہٹانے کے لیے اخبار پڑھنے لگا۔ ناگاہ ایک اشتہار پر نظر پڑ گئی۔ اخبار
کے مدیر کو ایک ایسے مترجم کی ضرورت تھی جو اُجرت پر بعض انگریزی اخبارات کا ترجمہ
کر سکے۔ مالک نے اس کام کو بہت پسند کیا۔ کیونکہ فوراً نہیں تو کچھ مدت میں اجرت کی رقم سے
دو سو روپیہ جمع ہو سکتا ہے۔ اس نے طے کر لیا کہ صبح کو سب سے پہلے یہی کام ہوگا کہ درخواست
لکھ کر اخبار کے دفتر میں ارسال کر دوں گا۔

(۷)

مالک اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اخبار کے آفس سے ترجمے کا کام ملنے لگا۔ اجرت
بھی معقول مقرر ہوئی اور ترجمے کا کام شروع کر دیا گیا لیکن ایک بڑی مشکل یہ آ پڑی کہ امتحان

کا زمانہ سر پہ آپہنچا۔ وکالت پاس کرنے پر آئندہ ترقیوں کا دارومدار تھا۔ اس لیئے اُدھر
سے بھی غفلت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور جلد سے جلد دو سو روپے فراہم کرنے کی فکر دامنگیر
تھی۔ محنتی آدمی تھا۔ اس نے رات دن میں بجائے چھ گھنٹے سونے کے صرف تین گھنٹے
آرام کرنا طے کیا۔ اور دس سے ایک بجے رات تک ترجمے کی خدمت انجام دینے کا ارادہ
کر لیا۔ پندرہ بیس روز تک بڑی تن دہی اور ژرف بینی سے اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔ اس
درمیان میں زہرہ نے کئی مرتبہ سمجھایا کہ اتنی محنت اچھی نہیں خدا نہ کرے دشمن بھی بیمار پڑ
جائیں گے تو کیا ہوگا؟ روپے کے واسطے جان ہلکان کرنا کون سی عقلمندی ہے؟ ابھی تو
منی بیگ کے اصلی مالک کا نام و نشان بھی معلوم نہیں کہ جلدی کی جائے۔ ایسا ہی ہے تو
اخباروں میں اعلان چھپوا دو۔ جب کوئی دعویدار نکلے تو میرے کانوں کے جڑاؤ بندے بیچ کر
دے دینا۔ خدا بخشے ابا جان نے پانچ سو کی مول لی تھیں۔ اب نہیں نہیں کر کے ساڑھے
تین چار سو کی تو بکیں گی۔ اس کا روپیہ دینے کو یہی کافی ہیں۔ اسی طرح بہت اونچ نیچ
سمجھائی لیکن مالک کی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ اپنے آرام کی غرض سے بیوی کا گہنا
فروخت کرے وہ برابر اپنی دھن میں ڈٹا رہا۔ صبح سے امتحان میں شریک ہوتا وہاں
سے واپس ہو کے دوسرے دن کے پرچے تیار کرتا اور دس بجے رات سے مطلوبہ
مضامین کا ترجمہ شروع کر دیتا۔ دوستوں سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ اگر کوئی
ملنے آتا تھا تو اسے مصروف دیکھ کے واپس جاتا تھا۔ وہ اتنی شدید محنت کا عادی نہ تھا
اب جو دفعتہ کاموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تو طبیعت کسلمند رہنے لگی۔ راتوں کی جاگ سے

سر بھاری اور آنکھیں جلنے لگیں۔ اسے معلوم ہو گیا کہ بخار سے یہی اصول قائم رہا۔ تو بی صحت خانم بہات سلام کر کے رخصت ہو جائیں گی۔ اجرت سے ابھی تک صرف پچھتر روپے جمع ہوئے تھے۔ سوا سو کی اور ضرورت تھی۔ اس رقم کے لئے کم سے کم سوا مہینے کی محنت کی ضرورت تھی۔

چونکہ مزاج میں استقلال کی صفت نو جبہ دھتی۔ اس لئے دل نہ چھوڑا۔ ایک ہفتے کے بعد خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا۔ اس درمیان میں اجرت کے پچیس روپے اور جمع ہو گئے تھے۔ وہ خوش تھا کہ امتحان ختم ہو چکا ہے۔ اب ترجمے میں پورا وقت صرف کروں گا۔ بابو شیام نرائن پلیڈر سے ملاقات ہے۔ ان کی معرفت عدالت سے نقلیں ترجمہ کرنے کو مل جائیں گی۔ خدا نے چاہا تو تھوڑے دن میں پچاس سے اوپر روپے مل جائیں گا۔

دوسرے دن اتوار کے دفتر سے واپس آ رہا تھا کہ جھرجھری سی معلوم ہوئی۔ ہاتھ پاؤں گرم اور آنکھیں سرخ ہیر بھبوکا ہو گئیں۔ جوڑ جوڑ میں درد کی کسک محسوس ہونے لگی۔ اس نے خیال کیا شاید کئی روز سے غسل کا وقت نہیں ملا ہے۔ اسی وجہ سے یہ کیفیت ہے۔ آج ضرور نہا ڈالنا چاہیئے۔ وہ غسل کی نیت سے مکان آیا۔ زہرہ سامنے ہی چوکے پہ بیٹھی سلیم کی پیاری پیاری باتوں سے دل بہلا رہی تھی۔ مالک کے چہرے پر جو نگاہ پڑی تو دل دھک سے ہو گیا۔ اس کی بھیٹی بھیٹی آنکھوں اور منہ کی سرخی نے اوسان خطا کر دیئے۔ سمجھی کہ روز کا جاگنا اور رات دن کی بے تکان مشقت رنگ لا رہی ہے۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر مالک کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھا تو نار شاد بخار چڑھا پایا۔

"ہے ہے نہیں تو بھینسوں بخار ہے۔" کہہ کر جلدی جلدی پلنگ پوشش ہٹا کر بچھونا صاف کیا اور مالک کو لیٹنے کی فہمائش کی۔

مالک میں بھی کھڑے رہنے یا بیٹھنے کی تاب نہ تھی۔ ہلنے کا ارادہ ملتوی کر کے لیٹ رہا۔ لیٹتے ہی ایسا لہلہا کے بخار چڑھا کہ نیٹڑے سے آنچ اٹھنے لگی۔ لگا اول فول بکنے۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی زہرہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مالک کے سوا گھر میں کوئی مرد مانس نہ تھا۔ جب وہی پڑ گیا تو حکیم ڈاکٹر کون بلائے۔ رہے دوست احباب، انھوں نے بھی امتحان میں مخل ہونے کے خوف سے آنا جانا موقوف کر دیا تھا۔ بڑے سوچ بچار کے بعد ایک تدبیر سمجھ میں آئی۔ اُس نے ماما کو بھیج کے اپنے خالو کو بلا بھیجا۔ ان بزرگوار نے فن طب کو باقاعدہ حاصل کیا تھا۔ الہ آباد میں ان کا مطب خوب چلتا تھا مگر تھوڑے دنوں سے مراق کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے الہ آباد کی سکونت ترک کر کے وطن میں قیام کیا تھا۔ اپنے مکان ہی میں مطب کھولا تھا۔ شہر میں نئی نئی حکمت شروع کی تھی۔ اس لیے لوگ کم واقف تھے۔ ماما نے جیسے ہی زہرہ کا پیغام پہنچایا جس طرح بیٹھے تھے اُس کے ساتھ اٹھ چلے آئے۔ زہرہ نے ساری کیفیت بیان کی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی، اُن کی رائے میں لال بخار تھا لیکن صحیح رائے قارورہ دیکھنے کے بعد طے کیا۔ فی الحال چند دوائیاں تجویز کر کے نسخہ لکھ دیا۔ دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے، مزید عنایت یہ کی کہ ماما کو ساتھ لیتے گئے اور اپنے سامنے عطار سے دوائیاں خرید دیں؛

(۸)

دوا علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مالک کی طبیعت روز بروز بگڑتی ہی گئی پندرہ دن کے بخار میں سوکھ کے کانٹا ہو گیا۔ دور سے ایک ایک پسلی گن لی جاتی تھی۔ زہرہ نے تیمارداری میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ دوا دارو میں حد سے زیادہ کی۔ روپیہ لٹھ کر پامال ہو گیا۔ شہر کا کوئی بڑا حکیم یا ڈاکٹر ایسا نہ تھا جس نے مالک کا علاج نہ کیا ہو۔ لیکن مرض پر کسی کا زور نہ چلا۔ دریغ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر میں تو یہ نوبت ہوئی کہ کروٹ بدلنا اور اٹھ کر چوکی پر بیٹھنا دوبھر ہوگیا۔ پائنتی لگا دی گئی تھی۔ دشوار ہو گیا۔ پلنگ کی ادوان کھول دی گئی۔ جب پاخانے پیشاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ زہرہ ہاتھوں کا سہارا دے کر نیچے کھسکا دیتی تھی اور فارغ ہونے کے بعد پھر اوپر سرکا دیتی تھی۔ اسی عنوان سے ایک مہینہ بسر ہوا۔ مالک نے اپنی گاڑھی کمائی کے جو سو روپے جمع کیے تھے دو مہینے کی آمدنی اور زہرہ کے طلائی گہنے فروخت ہو کر علاج میں صرف ہوئے پھر بھی ہنوز روز اول تھا۔ عورتوں کو گنڈے تعویذ پر بڑا اعتقاد ہوتا ہے۔ ہر چند زہرہ اس قماش کی عورت نہ تھی مگر شوہر کی سقیم حالت نے دنیا اندھیر کر دی تھی جس نے کوئی تدبیر بتائی وہ اُس پر عمل کرنے کو تیار ہو گئی۔ ماما کی صلاح سے دو تین مُلا سیانے بھی بلائے گئے۔ مالک کو بخار کی وجہ سے بالکل ہوش نہ تھا ورنہ وہ کسی طرح ان ڈھکوسلوں کو گوارا نہ کرتا۔ اُس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر جھاڑ پھونک کی گئی لیکن مرض کا جن نہ اترا۔

ادھر دو چار دن سے نہ معلوم کیوں زہرہ کے دل میں وہم سما گیا تھا کہ یہ بیماری اس شخص کی بددعا کا نتیجہ ہے جس کا منی بیگ اور روپیہ ان کے پاس ہے۔ جب تک وہ رقم واپس نہ کی جائے گی ان کا بخار نہ اترے گا۔ جوں جوں دوا اور دعا بے سود ثابت ہوتی تھی اس کا شک یقین سے بدلتا جاتا تھا اور اب تو یہ حالت تھی کہ بالکل صدق ہو چکا تھا وہ نمازوں کے بعد گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کرتی تھی کہ خدایا کسی ترکیب سے صاحب مال کا پتہ معلوم ہو جائے پھر ایک لمحہ کی دیر کیے بغیر اس کا روپیہ واپس کر دوں گی۔ دوسرے دن نوچندی جمعرات تھی۔ وہ منہ اندھیرے اٹھ کے نہائی۔ صاف کپڑے پہنے اور خشوع قلب سے صبح کی نماز ادا کی۔ پھر بال کھول کر پشت اور بازو پر بکھرائے۔ قرآن مجید سر پر رکھا اور آنگنائی میں کھڑے ہو کر الحاح و زاری سے مالک کی صحت اور صاحب مال کا نام و نشان معلوم ہونے کی دعا مانگنے لگی۔ اس کی صدف چشم سے آبدار موتیوں کی طرح آنسو ڈھل ڈھل کر نکلنے لگے۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ کم و بیش ایک گھنٹہ دعا میں گذرا۔ خدا کی بارگاہ میں دل کا مطلب بیان کر لینے سے کچھ ڈھارس ہوتی۔ اس نے قرآن شریف کو زردان کے جزدان میں لپیٹا اور احتیاط سے مچان پر رکھ کر کمرے میں آئی۔ مالک سو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار میں کمی ہو گئی تھی۔ پنڈا پسیجا ہوا تھا۔ گمان ہوتا تھا کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں تپ اتر جائے گی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ڈاکٹر نے فہمائش کی تھی کہ بخار اترنے پر فوراً چوزے کی یخنی اور انار کا عرق دیا جائے۔ اس لیے باورچی خانے جا کے یخنی کی تیاری شروع کی۔ اتنے

میں سلیم بیدار ہوا، اس کا ہاتھ منہ دھلا اور کرتا پہنا کر ماما کے ساتھ باہر بھیجا۔
دن میں پڑھنے لگا۔ یخنی تیار ہو گئی۔ بخار میں تخفیف ہونے سے مالک بھی ہوشیار ہوا۔
زہرہ نے کلی کرا کے یخنی پلائی اور پٹی پر بیٹھ کر رسان رسان ہاتھ پاؤں ملنے لگی۔ عرصہ
کے بعد معدہ میں غذا پڑنے سے سنسنی ہونے لگی۔ ساتھ ہی غنودگی بھی طاری ہو گئی۔ دس
بجے کے بعد ڈاکٹر آیا۔ نبض دیکھی۔ زہرہ نے پردے کی اوٹ سے حال بیان کیا۔ ڈاکٹر نے
بخار اترنے سے اطمینان ظاہر کیا۔ نسخہ میں طاقت کی ایک دوا بڑھا اور فیس لے کے
رخصت ہوا۔ اس کے جاتے ہی سلیم آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کسی پرانے اخبار کا پھٹا ہوا
ورق تھا۔ اس نے آتے ہی وہ ورق زہرہ کے ہاتھ میں دیا کہ اس کی ناؤ بنا دو۔ جب وہ
ضد کرتا تھا تو زہرہ بہلانے کی غرض سے کبھی کاغذ کی ناؤ کبھی حوض کبھی چوگھڑا بنا کر
دے دیا کرتی تھی۔ سلیم ان کاغذی کھلونوں سے بہت خوش ہوتا تھا اور جہاں کہیں کوئی
کاغذ پڑا پاتا تھا۔ اٹھا لاتا تھا۔ زہرہ نے اس کے ہاتھ سے ورق لے کر ناؤ بنانے کے
واسطے جیسے ہی موڑنا چاہا کہ "منی بیگ کی تلاش" والی سرخی پر نگاہ پڑی۔ اس نے
چونک کر عبارت پڑھنا شروع کی۔ سرخی کے تحت میں لکھا تھا

"نواب فریدوں مرزا کا مختار وثیقہ کا روپیہ لاتے ہوئے پارک میں گھبسنہ
دیکھنے کو رک گیا۔ غفلت میں منی بیگ جیب سے گر گیا۔ اس کے ننھے ننھے
بچے فاقوں کے مارے مر جائیں گے۔ لہذا اخبار کے ذریعہ سے اطلاع دی جاتی
ہے کہ جن صاحب نے منی بیگ پایا ہو وہ معصوم بچوں پر رحم کر کے واپس

کردیں۔ خدا ان کو جزائے خیر دے گا۔"

زہرہ کا دل کلی کی طرح کھل گیا۔ آنکھوں سے شادمانی ٹپکنے لگی اور بے اختیاری میں زبان پر جاری ہوگیا۔ "پروردگار! تیرا ہزار ہزار شکر" یہ کلمہ اتنی بلند آواز سے کہا گیا کہ مالک کی آنکھ کھل گئی اور اس نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"کیا ہے"؟

زہرہ۔ تو مبارک ہو۔ مراد آگئی

مالک۔ کیسی مراد؟

زہرہ۔ منی بیگ کے مالک کا پتہ چل گیا۔

اس مختصر سے جملے نے برقی رو کی طرح رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ یا تو مالک کو ضعف سے کروٹ بدلنا دشوار تھا یا خوشی کے زور میں آدھے دھڑ سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ زہرہ نے روکنا بھی چاہا مگر اس نے نہ مانا۔ مجبورًا زہرہ نے گاؤ تکیے رکھ کے اس سے ٹکا دیا۔ اور پھٹے ہوئے اخبار کا ٹکڑا ہاتھ میں دے دیا۔ مالک نے اسے پڑھا۔ معلوم اس خبر میں کس قیامت کی تاثیر تھی کہ جوں جوں پڑھتا تھا منہ پر رونق اور جسم میں توانائی بڑھتی جاتی تھی۔ جب اول سے آخر تک پڑھ چکا تو بولا۔

" یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میں صاحب مال کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میر نوازش علی صحیح النسب سادات ہیں۔ مگر زمانہ موافق نہیں ہے۔ پندرہ روپے مہینے میں جوں توں بسر کرتے ہیں۔ اس مفلسی اور تنگدستی پر کچا ساتھ بڑی مصیبت

ہے۔ خدا کی مصلحتیں بھی عجیب ہیں۔ چھ بچوں میں بیچارے کے یہاں کوئی لڑکا نہیں۔ نواب ہمایوں مرزا اتنے سخت ہیں کہ میر صاحب کی غربت پر پسیجنے والے نہیں جس طرح بھی ہوگا اپنے نقصان کی کوڑی کوڑی وصول کر لیں گے۔ ہا! خدا جانے اتنے دنوں میں بے نصیب بچوں پر کیا قیامت گذر گئی ہوگی۔"

زہرہ۔ آدمی کی تقدیر میں جتنی مصیبت بدی ہوتی ہے اس کا ہونا ضروری ہے۔ ہم لوگوں سے نادانستہ کوئی گناہ ہوگیا تھا۔ یہ اُسی کی سزا ملی ہے۔ تم ابھی میر صاحب کو بلوا بھیجو۔ میری یہ بالیاں حاضر ہیں۔ انہیں بیچ کر ان کا زر بیعہ دے دیا جائے گا۔ دیکھو انکار نہ کرنا۔ نہیں تو مجھے بہت رنج ہوگا۔ میں ان عورتوں میں نہیں ہوں جنہیں گہنوں میں لدے پھندے ہونے کا شوق ہوتا ہے۔ آخر یہ زیورات بکس میں فضول ہی تو پڑے رہتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرے دل میں وہم سما گیا ہے کہ تمہاری علالت اسی روپیے کے کارن ہے۔ جب تک وہ نگوڑا گھر میں رہے گا بیماریوں کا تانتا نہ ٹوٹیگا۔

مالک۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ جب تک میر نوازش علی کی تکلیفیں دور نہ کی جائیں گی۔ ہماری مصیبت بھی نہ کٹے گی میں نے تو بہت چاہا کہ تمہاری کوئی چیز نہ مٹے مگر خدا کی مرضی اس کے خلاف ہے۔

زہرہ نے مچے بالیاں سامنے لاکے رکھ دیں۔ مالک نے اسی وقت ماما کو میر نوازش علی کا پتہ بتا کر روانہ کیا۔ دن کے تین بجتے بجتے میر صاحب آموجود ہوئے۔ حقیقت میں وہ غریب بڑی سختی میں مبتلا تھے۔ نواب فریدوں مرزا نے اس غفلت

کی یہ سزا دی تھی کہ ماہ بماہ ان کے وظیفے سے دس روپے منہا کرنا شروع کر دیا تھا۔
ادھر انہیں اپنی اور اپنی جورو بچوں کی بسر گذر صرف پانچ روپے میں کرنا پڑتی تھی۔ آدمی
محتاط تھے قرض لینا عیب جانتے تھے مہنگی کا زمانہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ بال بچوں سمیت ایک
وقت فاقہ کرتے تھے اور دوسرے وقت مٹھی مٹھی بھر چنے چبانے کو میسر آتے تھے۔ مالک
نے ان کی مصیبت سن کر بہت افسوس کیا اور ساری سرگذشت بیان کر کے معافی
چاہی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب تک آپ ٹھنڈے دل سے معافی نہ عطا کریں گے۔ میں
اچھا نہ ہوں گا۔ اور زہرہ کی جڑاؤ بندے بالیاں حوالے کیں کہ انہیں فروخت کر کے ان
کی قیمت سے دو سو پانچ روپے دس آنے اصل اور تیس روپے میری جانب سے
ہرجانہ قبول فرمائیے۔ اس کے علاوہ جو روپیہ فاضل بچے وہ مجھے عنایت فرمائیے۔ ہر چند
میر نوازش علی فقر و فاقے کی بلا میں مبتلا تھے مگر بندے بالیاں بیچ کر روپیہ لینا گوارا نہ کرتے
تھے لیکن مالک نے اور پردے کی آڑ سے زہرہ نے اصرار پر اصرار کر کے مجبور کر دیا۔
میر صاحب کی کوشش سے تمام نگ بندے بالیاں چار سو کی بکیں۔ دو سو
تینتیس روپے دس آنے انہوں نے لئے اور ایک سو چونسٹھ روپے چھ آنے مالک کو
واپس کر کے ہزاروں دعائیں دیتے واپس گئے۔
اس قرض کے ادا کرنے سے مالک کا بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بخار تو آ ہی چکا تھا ڈاکٹر
کی دوا نے اور بھی روک تھام کر دی اور جس تیزی سے بیماری آئی تھی اسی سرعت سے
صحت بھی عود کرنے لگی۔ آٹھ دن نہ گذرے تھے کہ وہ بھلا چنگا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

صبح و شام ہوا خوری کے لئے پارک جانا۔ رات کو احباب جمع ہوتے۔ ان کی پرلطف باتیں دل کو انبساط پہنچاتیں۔ گزشتہ مصائب خواب و خیال ہو گئے۔ دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ پلک جھپکاتے دو مہینے ختم ہو گئے۔ امتحان کا نتیجہ نکل آیا۔ مالک ذہانت کے امتحان میں سب سے اول تھا۔ اُس کے دوست تہنیت کے واسطے جمع ہوتے۔ کوئی دعوت طلب کرتا تھا۔ کوئی جلسہ مانگتا تھا۔ وہ بھی اُن کے چھیڑنے کو کبھی انکار کبھی اقرار کرتا تھا۔ اِس وقت اُسے علیم اللہ کی یاد ستا رہی تھی۔ یکایک "السلام علیکم" کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ ایک غریب ٹھیکے میں درّانہ گھس آیا تھا۔ سب سے پہلے مالک نے پہچانا اور بیتابانہ اٹھ کر گلے سے چمٹ گیا۔ ساتھ ہی سب کے منہ سے "ہیں! علیم اللہ!" کا نعرہ بلند ہوا۔ جب مالک کے دل سے خوشی کا جوش کم ہوا تو علیم اللہ کو اپنے برابر بٹھا کر حال کی کیفیت پوچھی اور شکایتہً یہ بھی کہا کہ تم نے تو ہم لوگوں کو اپنے آنے کی تاریخ سے مطلع ہی نہیں کیا۔ ورنہ ہم لوگ اسٹیشن آ کر خیر مقدم کرتے اور تجارتی مسافروں کو احترام سے لاتے۔

علیم: میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے تو اطلاع نہیں دی اور آج دفعتاً آ کے نازل ہو گیا۔ (سو سو کے دو نوٹ دے کر) یہ تمہاری امانت حاضر ہے۔ میں بہت نادم ہوں کہ تم کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔

مالک: علیم بھائی! مجھے تو خیر! جو مصیبت پیش آنا تھی وہ آئی لیکن میر نوازش علی پر جو قیامت ٹوٹی اُس کا قلق زندگی بھر باقی رہے گا۔ (کل واقعہ بیان کر دیا)

علیم۔ آہ! یہ مصیبت اور وہ بھی میری وجہ سے۔

مالک۔ ہونے والی بات ہو چکی۔ اس کا خیال فضول ہے۔ در اصل مجھے میری کاہلی اور رہبر صاحب کو ان کے تغافل کی سزا ملی۔ اگر وہ روپیہ رکھنے سے بے احتیاطی نہ کرتے یا میں منی بیگ پاتے ہی پولیس کو دے آتا تو یہ نہ ہوتا۔

اس کے بعد پھر وہی دعوت اور جلسہ کا مسئلہ چھڑا۔ علیم اللہ کو ابھی تک ان واقعات کی اطلاع نہ تھی۔ مالک کے پاس ہونے کی بڑی خوشی ہوئی اور یہ کہنے دوسرے احباب کا ہمنوا ہو گیا۔ مالک نے دعوت دینا منظور کیا۔ دن تاریخ معین ہوئی۔ دس بجے سب رخصت ہوئے۔ مالک پھاٹک بند کر کے اندر گیا۔ زہرہ جاگ رہی تھی اس نے وہ دونوں نوٹ اُسے دے کر کہا۔

"لو، علیم اللہ نے یہ نوٹ دیئے ہیں۔"

زہرہ۔ کیا وہ حج کر کے آگئے؟

مالک۔ ہاں، ہاں، اب خدا نے ہماری مصیبت کاٹ دی۔ میں امتحان میں کامیاب ہوا۔ اب روزانہ کچہری جایا کروں گا۔ کام ملتا رہا تو تمہارا سب زیور پھر بن جائے گا۔

زہرہ۔ مجھے زیور کی ضرورت نہیں۔ تم سلامت رہو، یہی میرا زیور ہے۔ ہاں، یہ نوٹ مجھے کیوں دیئے؟ رہبر صاحب کو دینا چاہیئے تھے۔

مالک۔ کیوں، انہیں تو روپیہ دے دیا گیا ہے۔

زہرہ۔ وہ تو اس غفلت کا کفارہ تھا جو ان کی طرف سے برتی گئی اور یہ

اُن کا حق ہے۔

مالک۔ زہرہ! تم عورت نہیں فرشتہ ہو۔ بیشک! یہی ہونا چاہیئے۔ اُس دن اُن کا منی بیگ واپس کرنا بھول گیا تھا۔ اُس میں پانچ روپے دس آنے اسی طرح رکھے ہیں۔ کل ان کے مکان جاکے روپیہ اور منی بیگ واپس کردوں گا۔

دوسرے دن مالک نے خود میر نوازش علی کے گھر جاکر نوٹ روپے ریزگاری اور منی بیگ واپس کیا۔ وہ ہر چند لینے سے انکار کرتے رہے لیکن مالک نے کہا۔ آخر انہوں نے مجبور ہوکے اس عطیہ کو خدا کی رحمت سمجھا اور اس سے اپنی دو لڑکیوں کی شادی کا انتظام کردیا۔

مالک نے بڑی سبز چشمی سے احباب کی دعوت کی۔ ذہین آدمی تھا۔ چند روز کی پریکٹس میں چل نکلا۔ وہ عروج کے زمانے میں بھی میر نوازش علی کو نہ بھولا۔ ہمیشہ ان کی خبر گیری کرتا رہا۔ زہرہ نے اپنی جیب خاص سے ان کی بقیہ چاروں لڑکیوں کو بیاہ دیا۔ ان نیکیوں کے بدلے میں خدا نے اس کو خوب نوازا۔ دھن دولت سے گھر اور اولاد سے گود بھری۔ :

تدبیر

(۱)

چودھویں رات کا چاند نور برسانے اور خلقت کا زیادہ حصہ آرام کرنے میں مصروف تھا۔ گرمی کی رُت تھی اور مکان کی چھت پر دو پلنگ برابر برابر بچھے تھے۔ ایک پلنگ پر نوجوان عورت اپنے شیر خوار بچے کو لئے سو رہی تھی۔ دوسرے پر ایک جوان جہان مرد بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ تازی مصیبت اور فکروں کے ہجوم نے اُسے دھوپ کھائے ہوئے پھول کی طرح مرجھا دیا تھا۔ سینے میں آگ دھک رہی تھی اور اس کی تپش سے تن بدن پھنکا جاتا تھا۔ بہت دن نہیں گذرے تھے کہ وہ اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ خوش مذاق بذلہ سنج اور لطیفہ گو سمجھا جاتا تھا لیکن مصائب کا نزول ہوتے ہی اُس کی زندہ دلی آندھی کے جھکڑ کی طرح غائب ہوگئی۔ احباب کی

تفریح بخش صحبتوں کے بدلے گوشۂ تنہائی مرغوب ہوا۔ انہوں پر مہر سکوت لگ گئی۔

جہاں بیٹھا ہے۔ سر زانو پر دھرا ہے۔ مستقبل کا خیال پیشِ نظر ہے۔ یوں تو عرصہ سے اُس کے والد کی علالت کا سلسلہ جاری تھا جس سے مالی نقصانات کے علاوہ تعلیمی سلسلہ بھی قطع ہو چکا تھا۔ مگر ادھر کے تین مہینے تو خدا کی پناہ۔ حکیموں، ڈاکٹروں کی فیس، دوائی ٹھنڈائی کی قیمت ادا کرنے میں مسکونہ مکان پر اس کی قیمت کے قریب بار ہو گیا۔ گرہستی کا بیشتر حصہ فروخت ہوا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مرض کی دوائیں تو ہزاروں ہیں مگر موت کی دوا کوئی نہیں۔ ہوا وہی جو ازل کے دن سے مقرر ہو چکا تھا۔ غریب سنجھو کو باپ کی سوگ نشینی کے ساتھ ساتھ بیت و اثاث البیت کا بھی ماتم دار ہونا پڑا۔ قرض خواہوں کو کسی کے دکھ درد کی کیا پڑی ہے۔ وہ اپنا روپیہ چاہتے ہیں اور مفلسوں کی جیبیں نقرئی اور طلائی سکوں کی زیب و زینت سے بے نیاز ہیں۔

سنجھو کی مستقل آمدنی کوئی نہ تھی۔ نیز تعلیم مکمل کرنے اور صاحبِ فراش باپ کی تیمارداری کے خیال نے ملازمت تلاش کرنے یا کسی اور کام کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ دی۔ اب جو دفعتہً گرہستی کا بار گلے پڑا تو عقل چکرائی۔ کچھ کرنے دھرنے بنتا ہے نہ کوئی تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ باپ کا اندوختہ ان کے علاج اور مرنے میں صرف ہوا۔ اگر پرانی خدمات اور اُن کی دیانت کا خیال کرتے ہوئے ریاست سے بطور پنشن اُن کا وظیفہ مقرر نہ ہو جاتا تو ان کی زندگی ہی میں گھر بار بک کر ٹھکانے لگ جاتا۔ اُن کی

آنکھ بند ہونا تھی کہ ان کی پنشن موقوف ہوگئی اور بیچارے سنجھو کے افکار میں معیشت کی فکر کا اضافہ ہوگیا۔ یہ رنگ دیکھ کے مہاجنوں کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ نالش دائر کر دی۔ سنجھو ان کے دین سے منکر نہ تھا۔ عدالت سے ڈگری ہوگئی۔ بعض قانون دانوں نے قانونی اڑنگے لگانے کا مشورہ دیا۔ لیکن سنجھو نے یہ کہہ کے رد کر دیا۔ کہ میرے پاس ادائی کے واسطے پھوٹی کوڑی نہیں۔ نہ کہیں سے کچھ رقم ملنے کی امید ہے۔ پھر خواہ مخواہ جھگڑے بکھیڑے نکال کر حیران کرنے اور پریشان ہونے سے کیا فائدہ ہے؟ جو جو دن گذریں گے اصل پر سود کی رقم اضافہ ہوتی جائے گی تھوڑی مدت کے بعد جب مکان نیلام ہوگا تو اس کی قیمت منہا کر لینے کے بعد مہاجنوں کی معقول رقم واجب الادا رہے گی۔ چونکہ میری شرارت سے انہیں کافی نقصانات جھیلنا اٹھانا پڑیں گی اس لئے قابو پاکر وہ بھی نرمی اور مروت نہ کریں گے۔ عجب نہیں جو اپنے مطالبے کی پائی پائی وصول کرنے کی امکانی کوشش کریں گے اور میری ذات بھی محفوظ نہ رہ سکے گی۔ صلاح دینے والے جواب سن کے خاموش ہوگئے۔ مکان نیلام ہوگیا۔ خریدار نے تخلیہ کرنے کا نوٹس دیا۔ ایک مہینے کی مدت دی تھی جس کا ایک اٹھوارہ ختم ہوچکا ہے۔ اس درمیان میں سنجھو کا کوئی لمحہ فکر سے خالی نہ گذرا تھا۔ پھر بھی کوئی مفید بات ذہن میں نہیں آئی۔ اگرچہ وہ ایک بچے کا باپ ہوچکا تھا۔ لیکن دنیوی تجربے میں بالکل کورا تھا۔ سودا سلف خریدنے کا سلیقہ نہ گھرداری کی تمیز۔ اب تک اس کی زندگی درسیات کی کتابیں پڑھنے اور باپ کی تیمارداری کرنے میں گذری تھی عقیلہ

رنجھو کی بیوی اکے کہنے سننے اور جرات دلانے سے کئی مرتبہ مکان تلاش کرنے نکلا۔ سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانی مگر حسب منشا مکان نہ ملا۔ دو چار گھر دیکھے۔ ان کا کرایہ اتنا زیادہ تھا جس کا متحمل ہونا مشکل تھا۔ وہ سارا سارا دن سرگاڑی، پاؤں پھیلا کر کے گھسیٹنے کے سوا کوشش کا دوسرا طریقہ نہ جانتا تھا۔ جوں جوں وقت منقضی ہوتا تھا مشکلات میں زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ آج بھی تمام دن پھرنے کے بعد مکان آیا تھا کسی زمانے میں تو وہی نیند آتی تھی جو جوانی کے نام سے نامزد کی جاتی ہے مگر اب وہ نیند کالے کوسوں تھی کبھی کبھی چاندنی راتوں کا پر کیف منظر روح افزا تھا وہ آج جانگسل ہے۔ کبھی دن بھر کی تھکن کے بعد رات کا سکون جنت اثر معلوم ہوتا تھا اب جہنمی عذاب سے زیادہ خطرناک ہے کروٹیں بدلتے بدلتے آدھی رات گذر گئی۔ بن بن کے لیٹا۔ نیند کو بلانے کے ہزاروں جتن کیے مگر سب بے سود۔ گھڑیال نے دو بجائے ہوں گے کہ بچہ کٹمنا کے رویا۔ عقیلہ کی آنکھ کھل گئی اس نے بچہ کو دودھ پلا کے پھر سلا دیا۔ ایک کروٹ لیٹے لیٹے پسلیاں دکھنے لگی تھیں، تھوڑا آرام لینے کی نیت سے پہلو بدلا تو رنجھو کو جاگتے پایا۔ وہ آدھی آدھی رات تک جاگنے کا عادی نہ تھا۔ خلاف معمول بیدار پا کر مزاج کی بدمزگی کا اندیشہ پیدا ہوا۔ اس نے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے دونوں آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔"

رنجھو۔ ہاں، آج دولت کی طرح نیند بھی آنکھوں سے غائب ہے۔ اندھیری رات ہوتی تو تارے گننے کا مشغلہ خوب تھا۔ کچھ نہ کچھ تو دل بہل ہی جاتا۔ مگر چاندنی

میں سکونِ قلب کے ساتھ وہ بھی عنقا ہو گئے ہیں۔

عقیلہ۔ یہ تم کو کیا ہو گیا ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو؟ تمہاری حالت دیکھ دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑے جاتے ہیں! ایسے بُرے بُرے وہم آتے ہیں کہ جی پریشان ہو جاتا ہے۔ خدا کا واسطہ طبیعت سنبھالو، ہوش میں آؤ۔ کیا کسی کے ماں باپ مرتے نہیں ہیں؟ غور کرو گے تو ہزاروں یتیم اور بسیر نظر آئیں گے۔ مگر ان میں کوئی تمہارے دشمنوں کی طرح سڑی سودائی نہ ہوگا۔

سنجھو (ٹھنڈی سانس لے کر) بالکل ٹھیک ہے۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ مگر میری سی مصیبت اور دل پر کم پڑی ہوگی۔ تخلیہ مکان کا نوٹس ملے ایک ہفتہ ہو گیا۔ میں نے بلا ناغہ دن بھر گھوم کر مکان تلاش کیا لیکن میرے اطمینان کے ساتھ کرائے کے گھروں کا بھی کال پڑ گیا ہے! چند مکان ملے بھی تو مطلب کے نہ تھے۔ جن مکانوں میں پردے کا انتظام تھا ان کا کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ ہماری غربت متحمل نہیں ہو سکتی۔ اور روپیہ ڈیڑھ روپے کرائے والے مکانوں میں پردہ ممکن نہیں۔ یہ بھی گوارا نہیں کہ نوٹس کی میعاد ختم ہونے کے بعد کچہری کے پیادے آ کے نکالیں اور باپ دادا کی عزت پر پانی پھیرے۔ انہیں فکروں کے مارے ملکان ہوا جاتا ہوں۔ تم سے تو سینکڑوں کرتا ہوں لیکن بن کوئی نہیں پڑتی۔

عقیلہ۔ یہ تو کوئی ایسی فکر و تردد کی بات نہیں۔ ایسے مکان تو بہت ملتے ہیں، جن کا کرایہ دو ڈیڑھ روپے سے زیادہ نہیں ہے اور پردے کا بھی معقول بندوبست ہے۔

صبح شبراتن کنجڑن ترکاری دینے آئی تھی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اُس کے گھر کے قریب ایک مکان ڈیڑھ روپے مہینے کرائے کا خالی ہے۔ پہلے کوئی منشی جی رہتے تھے۔ چار چھ دن ہوئے کہیں چلے گئے ہیں۔ کل جا کے اس مکان کو دیکھ آؤ۔ اگر مرضی کے موافق ہو تو اٹھ چلو۔

(۲)

پسند کے موافق مکان مل گیا۔ سنجھو اپنی بیوی اور بچے کو لے کر اٹھ گیا۔ اگرچہ سودا سلف خریدنے کی تمیز نہ تھی لیکن عقیلہ نے گھر میں بیٹھے بیٹھے ایسا اچھا انتظام کر دیا کہ سنجھو کو ذرا بھی زحمت نہ ہونے پائی۔ روز صبح کو کنجڑن کی لڑکی دونوں وقت کی ترکاری دے جاتی ہے۔ غریبی حالت میں گوشت کہاں میسر، گاہے ماہے کے لئے ایک قصائی کو لگا لیا ہے جو پھیری کرتے وقت روزانہ پتہ کے پوچھ جاتا ہے۔ قریب ہی بنیئے کی دوکان تھی۔ اس سے بھی کنجڑن کی معرفت سمجھوتہ کر لیا ہے۔ ایندھن بھی بنیئے کی دوکان سے ملنے لگا۔ الغرض عقیلہ کی سلیقہ مندی نے گھر بیٹھے کل انتظام کر دیا اور سنجھو کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ یہ سب مرحلے جو اس کے خیال میں رستم کے ہفت خواں سے کم نہ تھے کب اور کیونکر طے ہو گئے۔ البتہ گھر چلانے کی فکر اُس کی ذات سے وابستہ رہ گئی۔ وہ میٹرک کا امتحان پاس کر چکا تھا اور قصد یہ تھا کہ کسی سرکاری محکمہ میں پچیس تیس کی جگہ پر تقرری حاصل کر لے لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ آج کل ملازمتیں کم اور امیدوار زیادہ ہیں، جہاں کسی جگہ کے خالی ہونے کا علم ہوا اور سینکڑوں درخواستیں پہنچ گئیں۔ اول تو انتخاب میں آنا مشکل ہے

پر فرقہ بندی اور قومی تعصب اضعاف مضاعف۔ سفارش کی زحمت اور تالیف قلوب کے اخراجات لازمی سنجھو کو ان باتوں کا تجربہ نہ تھا۔ سمجھتا تھا کہ اسکول اور کالج کی ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ کافی ہوتے ہیں محض اس واحد خیال کی بنا پر اس نے بعض محکموں میں درخواستیں بھیجیں۔ اور کامیابی کی امید میں انتظار کی ساعتیں گن گن کے بسر کیں نتیجے میں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ بعض جگہیں تو ایسے امیدواروں سے پر ہو گئیں جو سنجھو کے مقابلے میں بالکل ناکارہ تھے۔ مگر غریب سنجھو اس رمز کو مطلق نہ سمجھا اور اپنی ناکامی کو قسمت کی کوتاہی تصور کرتا رہا۔ جب کافی سے زیادہ ٹھوکریں کھا چکا اور سختی سے بسر کرنے پر بھی بیوی کی طلائی چوڑیاں فروخت ہو کر پیٹ کی دوزخ پاٹنے کے کام آ چکیں تو کسی خدا کے بندے نے ترس کھا کے بتایا کہ "یوں خالی خولی درخواست دینے سے کچھ نہ ہو گا پہلے اچھی سی سفارش حاصل کرو پھر بابو لوگوں کا منہ میٹھا کرو جب کہیں کوئی جگہ مل سکتی ہے۔" سفارش تو خیر مل سکتی تھی۔ اس کے والد بڑے بڑے نوابوں کی ڈیوڑھیوں پر جایا کرتے تھے۔ اکابرین اور معززین کی حضوری کا شرف حاصل تھا۔ کوئی نہ کوئی رحم کھا کے سفارش لکھ دے گا لیکن بابو لوگوں کا منہ میٹھا کرنے کی رنج بڑی ہے۔ اس کے واسطے نقد علیہ السلام کہاں سے آئیں؟ اس نے بعض لوگوں کی زبانی یہ بھی سنا تھا کہ لینے دینے سے عارضی طور پر جگہ مل جاتی ہے۔ لیکن اسے قیام نہیں ہوتا ہے۔ پھر سوا کوئی کے بعد پھر وہی بیکاری نصیب ہوتی ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اگر بچی بچائی سا ند بردل بیچ باچ کر بابوؤں کا منہ میٹھا کیا گیا اور عارضی ملازمت ملی تو اس سے

ہوگا؟ باوجود ان مشکلات کے بھی وہ چپکا نہ بیٹھا کچھ نہ کچھ کوشش جاری رکھی۔ دوڑنے دھوپنے سے تھوڑا بہت تجربہ بھی ہوا۔ ایک آدھ سفارش بھی ملی لیکن فلاح کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ یونہیں مہینہ ڈیڑھ مہینہ گذر گیا۔ آمد ایک کوڑی کی نہیں اور کھانے پینے کا خرچ بند ہونا ناممکن۔ اب تک عقیلہ زیور بیچ بیچ کر خرچ چلاتی رہی تھی۔ دل ہی دل میں حیران کہ الٰہی یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی؟ انہیں کوئی نوکری ملتی نہیں کوئی دستکاری آتی نہیں آخر ہونا کیا ہے؟

ایک رات جب کھانا کھا کر بیٹھا تو اس نے پوچھا۔

"تم کو نوکری تلاش کرتے اتنے دن ہو گئے۔ اب تک کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوا آخر آئندہ کے واسطے کیا سوچا ہے؟ میرے ہاتھ گلے میں جو دو ایک چیزیں باقی ہیں یہ بھی کچھ دنوں میں ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت کیا ہوگا؟"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا بتاؤں کیا ہوگا؟ میں نے تو ہزاروں تدبیریں کیں لیکن قسمت سیدھی نہیں ہوتی۔ اباجان کو خدا بخشے وہ تو مر گئے اور مجھے دنیا کے اتھاہ سمندر میں غوطے کھانے کو چھوڑ گئے جہاں لیل و نہار کی موجیں اٹھ رہی ہیں۔ آفات اور حوادث کا بھنور پڑ رہا ہے غم و ہم کا عظیم طوفان بپا ہے۔ سچ کہتا ہوں جس زندگی کے پیچھے لوگ سینکڑوں ہاتھ مارتے ہیں میں اس سے اتنا عاجز اس قدر بیزار ہوں کہ کوئی جھوٹوں مانگے تو دینے کو تیار ہوں۔ جب بوڑھوں کو دیکھتا ہوں تو ان کی جوانمردی پر حیرت ہوتی ...ں نے دنیا میں اتنے دنوں کیوں کر بسر کی۔ کوئی ہنستا ہے تو تعجب ہوتا ہے

کہ اس نے ہنسنے کی جرأت کیسے کی! ہیں تو سچ ہے ع

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست

کا مصداق ہو رہا ہوں۔ نہ مرتے بنتا ہے نہ جینے۔ خودکشی حرام بتائی جاتی ہے اور خودکشی کرنے والا گنہگار ہوتا ہے لیکن میں نے یہ خیال کر کے کہ اگر ایک گناہ آئندہ صادر ہونے والے گناہوں اور زندگی کے مصائب سے بچا سکے تو مضائقہ نہیں۔ ایک دفعہ سنکھیا پھانکنے کا ارادہ کیا تھا۔ نجانے نصیبوں میں کیا بدا ہے کہ ع

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

جیسے ہی پڑیا منہ تک پہنچی کہ تمہارے خیال اور رحمٰن (لڑکے کا نام) کی محبت نے ہاتھ مروڑ کر چھین لی اور سنکھیا کو خاک میں ملا دیا۔

عقیلہ (دانتوں میں انگلی دبا کر) ہا! ایسا نہیں چاہیے۔ تم مرد بچے ہو۔ تمہارے منہ پہ یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ دنیا امتحان گاہ ہے۔ اور مصیبتیں شرافت و رذالت پرکھنے کی کسوٹی ہیں۔ اماموں پیغمبروں کو کون کہے وہ اللہ کے پیارے تھے ان پر جو جو بلائیں نازل ہوئیں ہم پر تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ان کے علاوہ بھی کوئی دنیا میں ایک حال پر نہیں رہتا۔ عروج اور زوال چولی دامن کی طرح ساتھ ساتھ ہیں۔ دن کا نور مدھم پڑتا ہے تو رات کی سیاہی بڑھ جاتی ہے یہی حالت رنج و راحت کی ہے۔ ہم مصیبتوں پر صبر کریں گے تو اللہ اجر دے گا۔ بے صبری کریں گے تو اپنے آلام کو بڑھانے کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ جس خدا نے تکلیف ڈالی ہے وہی آرام بھی دے گا ہمیں اپنی تدبیروں

اور کوششوں سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔ اگر تمہاری طرح ہر شخص برے وقتوں میں جان دینے پر آمادہ ہو جایا کرے تو یہ نامعلوم اور یہ معصیت رسم عام ہو جائے اور رفتہ رفتہ ساری دنیا کا خاتمہ کر دے کیونکہ یہاں کوئی بشر مصیبت سے خالی نہیں۔ کیا تم کسی اور کو بھی اس طرح سے جان سی گراں مایہ چیز یوں ضائع کرتے دیکھتے یا سنتے ہو؟ ان مہمل خیالوں سے توبہ کرنے کی کوشش کرو ہمت ہارنا مردوں کا شیوہ نہیں ہے۔

سنجھو۔ میری اچھی ناصحہ! مجھے اس ناتمام ارادے پر شرمندہ نہ کرو۔ جسے مخفی رکھنے کی نیت پر بھی باتوں کی رو میں کہہ گیا ہوں اس کی نامومیت اور معصیت کا قائل ہوں۔ مجھے آئندہ ان مصائب سے مقابلہ کرنے کے اصول بتاؤ۔ میرے امکان میں جتنی کوششیں تھیں کر دیکھا پچیس تیس کی ملازمت تو ایک طرف دس روپے کی نوکری بھی نہیں ملتی۔ رہی تجارت تو اس کے اصولوں سے واقف نہیں۔ اس پر بھی جرات کر دوں تو روپیہ کہاں سے آئے؟ قرض ملنا محال ہے۔ ملا بھی تو نفع کی رقم سود میں چلی جائے گی اور میں وہی موچی کا موچی رہوں گا۔

عقیلہ۔ ہاں تمہارا یہ کہنا بالکل درست ہے میں نوکری سے تو خوش نہیں چاہے ہزار روپے مہینے کی ہو کیونکہ پرائی نوکری بنا رہی غلامی کے برابر ہے۔ اپنی خوشی سے رکتے ہیں نہ جاگ سکتے ہیں۔ آزادی سلب ہو جاتی ہے پھر مہینے پر وہی اتنی گنی تنخواہ نہ گھٹے نہ بڑھنی ہے۔ تجارت ایک پیسے کی بھی اچھی بڑھے تو بے حساب بڑھ سکتی ہے۔ مگر قرض لے کر کام کرنے کی رائے میں بھی نہ دوں گی۔ بقول تمہارے نفع کی رقم تو سود

تی میں چلی جائے گی۔

سنجھو۔ پھر تمہیں سوچو کیا کرنا چاہیئے؟

عقیلہ۔ میری بالیاں بیچ کر دو چار روپے میں تھوک فروشوں سے رومال، موزے، بنیائن خرید لو۔ سستی چیزوں کے گاہک بہت ہوتے ہیں اور جلدی بک جایا کرتی ہیں۔ بازار میں دو چار چکر لگاؤ گے تو روپیہ دھیلی ضرور مل رہے گا۔ نفع ہونے سے حوصلہ اور شوق بڑھے گا، خوب جی لگا کے محنت کرو گے۔ خدا نے چاہا تو سال بھر میں کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔

سنجھو (کچھ رک کر) کہتی تو سچ ہو لیکن بد قسمتی سے جس طرح اب تک پرورش پائی ہے وہ اس تجارت کو گوارا نہیں کرتی۔ جب میں ہاتھ میں کہنیوں تک رومال، موزے بنیائن لٹکا کر آوازیں لگاؤں گا اور میرے اسکول کے دوست دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟

عقیلہ کہیں گے کیا، تمہاری غیرت اور جفاکشی کی تعریف کریں گے۔ خدانخواستہ تم برا کام تو کرتے نہیں ہو۔ اپنی قوتِ بازو سے شریفانہ طور پر آذوقہ پیدا کرتے ہو۔ اچھا یہ تو بتاؤ اگر تم کہیں نوکر ہو جاؤ تو اس وقت تمہارا یہی فرض ہو گا نا کہ اپنے مالک یا افسر کے سامنے ماتحت یا ملازم کی حیثیت سے مؤدب کھڑے رہو اور وہ جو حکم دے۔ اس کی تعمیل کرو؟

سنجھو۔ بے شک۔

عقیلہ۔ اسکول میں تمہارے ساتھ جو طلبا پڑھتے تھے ان میں ہر قسم اور ہر درجے کے لڑکے ہوں گے؟ اتفاق سے جہاں تم ملازم ہوئے ہو وہاں تمہارا کوئی ایسا

دوست آجائے جو تمہارے مالک یا افسر کا ہم رتبہ ہو اور تم سے بھی دوستانہ تعلقات رکھتا ہو۔ کیا اس وقت تم کو شرم نہ آئے گی کہ تمہارا افسر اس کی تو یہ عزت کرے کہ صورت دیکھتے ہی تعظیم کو اٹھ کھڑا ہو، اپنے پہلو میں جگہ دے اور تمہاری یہ بے وقعتی کہ تمہارے سامنے بیٹھنے کی بھی اجازت نہ دے۔ خدا نہ کرے تمہارے دشمن ذات پات میں بیٹے ہیں، مگر وہی ملازمت کا نقص تمہاری عزت گھٹانے والا ہوگا۔

سنجھو۔ میں اس باب میں بحث نہیں کرنا چاہتا تمہاری دلیلیں غلط نہیں۔ مگر میں بھی مجبور ہوں کہ میرا ضمیر قبول نہیں کرتا۔

عقیلہ زیور کی پوٹلی سامنے رکھ کر۔ میں بھی تم کو مجبور کر کے تمہارے ضمیر پر جبر کرنا نہیں چاہتی۔ یہ گہنا حاضر ہے۔ اسے بیچ کر جس چیز کی چاہے دوکان رکھ لو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ برکت دینے والا ہے۔ میں بھی خالی نہ بیٹھوں گی۔ گھرداری سے جتنا وقت بچے گا سلائی کا کام کروں گی۔ میری پڑوسن بہت نیک بیوی ہیں۔ بےچاری کے میاں کو مرے مدت ہوئی۔ خدا کے سوا کوئی دھنی دینے والا نہیں۔ وہ سلائی کر کے پیٹ پالتی ہیں۔ میری مصیبت پر ترس کھا کر وعدہ کر گئی ہیں کہ کل سے میرے واسطے بھی اجرتی کام لیا کریں گی۔

(۲۳)

عقیلہ کے کہنے سننے اور ہمت بندھانے سے سنجھو نے میدان عمل میں گامزن ہونا قبول کر لیا۔ غرض سے تو خود ہی متنفر تھا۔ بیوی کا زیور کام میں لانے شرم دامنگیر تھی۔

لیکن کچھ ضرورت وقت کچھ عقیلہ کے اصرار سے راضی ہو گیا۔ نوید رنگا اور بازار میں چھوٹی سی دکان کھول دی گئی۔ وقت کی پابندی کے ساتھ بیٹھنا بھی شروع کیا چونکہ دکانداری کے اصول سے خبردار نہ تھا اس لئے خوب۔ ارزاں پر قابو نہ پا سکا۔ ناکامی کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ تھوک فروشوں نے اسے اکیلا سمجھ کر ایک ایک کے چار چار گنوا لئے تھے۔ اگرچہ اس نے منافع قدر قلیل ہی رکھا تھا۔ لیکن مہنگی چیزیں ملنے کی وجہ سے تھا بڑے سستا سودا نہ بیچ سکا۔ خریدار آنکس تھے وہ صفائی سے وہی قیمت بتاتا تھا جس سے کم پر فروخت کرنا اس کے واسطے خسارے کا باعث تھا۔ خریدار کمی کی خواہش کرتے تھے وہ قیمت گھٹانے سے انکار کر دیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گاہک پلٹ جاتے تھے۔ وہ دن بھر دکان پر مکھیاں مارنے کے بعد شام نڈھال نڈھال گھر آتا تھا تو عقیلہ کیفیت پوچھتی تھی مگر وہ کچھ بتا نہ سکتا تھا۔ بار بار کے تقاضوں پر قسمت کا گلا کر کے خاموش ہو جاتا تھا۔ اب گھر کے اخراجات کے علاوہ دکان کا کرایہ تیل بتی کا صرف بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ عقیلہ کے ہاتھ گلے میں تانبے کا تار تک باقی نہ تھا جو ٹوٹنے والوں تو تنگی کا سہارا ہوتا۔ آئندہ کی تمام امیدیں تجارت کی کامیابی پر منحصر تھیں جنہیں روز کے تلخ تجربے کند چھری سے حلال کئے ڈالتے تھے۔ دکان کی حالت روز بروز ابتر ہو رہی تھی۔ عقیلہ آئندہ پیش ہونے والی مصیبت سے ناواقف نہ تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ آلام و مصائب کا پہاڑ اس چھوٹے سے خاندان کو پیسنے چلا آ رہا ہے۔ آٹھوں پہر فکر میں ڈوبی رہتی تھی۔ جہاں کوئی ترکیب ذہن نشین ہوتی اور اس نے سنجیدگی سے بیان

کر دی۔ لیکن کیا کرتی پردے کی قید سنجھو کے ساتھ رہنے اور تجارتی کاموں میں ہاتھ بٹانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اپنے ہاتھ پاؤں سے جتنا ہو سکتا تھا اس سے غفلت نہیں کی۔ گھر کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر اجرتی سینا سینی تھی۔ بچے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی میں مشغول ہوتی تھی۔ یہ اس کی شدید محنت اور جفاکشی کا نتیجہ تھا کہ دو مہینے تک سنجھو کو بجز دوکان کا صرف برداشت کرنے کے گھر میں ایک پیسہ بھی خرچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ صرف عقیلہ کی سخت محنت اور جانفشانی کا روپیہ اُٹھتا رہا۔ مکان کا کرایہ۔ روزہ کا کھانا پینا۔ دھوبی کی دھلائی۔ بہشتی کی اجرت۔ مہتر کی تنخواہ۔ بچے کی جڑاول وغیرہ بنانے میں سلائی کی جمع کی ہوئی اجرت صرف ہوتی رہی اور دکان کا یہ حال تھا کہ کرایہ ادا کرنے کو روپیہ نہیں۔

ان ناکامیوں سے تنگ ہو کر سنجھو نے ایک دن اپنی بیوی سے کہا۔

" میں ڈھائی مہینے سے دکان پر بیٹھتا ہوں مگر اتنا بھی مال نہیں بکتا کہ وقت پر دکان کا کرایہ ادا کر سکوں۔ جتنا سرمایہ تھا وہ یوں برباد ہوا۔ اب اتنا بھی نہیں کہ فاقے کے وقت چبینا بھنا کر فاقہ شکنی کی جاسکے۔ دکان پر بیٹھنا گویا وقت ضائع کرنا ہے۔ کاش! میں تجارت کی لائن نہ اختیار کرتے اپنی پہلی ہی دھن میں لگا رہتا۔ تو اب تک پندرہ بیس کی ملازمت ضرور مل جاتی اور کم سے کم روکھی سوکھی روٹیوں کا سہارا تو رہ جاتا میں تم سے بہت نادم ہوں کہ بجائے آرام پہنچانے۔ اچھا کھلانے۔ اچھا پہنانے کے تمہارے میکے کی چیزیں بھی تلف کر دیں۔ تم سے زیادہ معصوم بچے کا غم ہے۔ وہ

مجھ ایسے بدبخت کے گھر پیدا ہوا جہاں مصیبتوں کے سوا کچھ نہیں۔ یہ کڑکڑاتا جاڑا دیکھو اور غریب کے گلے میں بہن سوتی کرتہ دیکھو۔ آہ میں تو زندگی سے عاجز ہوں۔ دعائیں مانگتا ہوں کہ کتے بلی کی آئی ہوئی مجھے آجائے ـــــــ۔"

عقیلہ سے سنا نہ گیا۔ بیتاب ہو کر سنجھو کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"خدا نہ کرے تمہارے دشمنوں کو جو تمہارا برا چاہتے ہیں۔ تجارت میں نفع و نقصان ہوتا ہی رہتا ہے۔ تم نے اب سے پہلے کوئی کام بھی تو نہیں کیا تھا۔ ناتجربے کاری کی وجہ سے گھاٹا ہو رہا ہے ہفتے عشرے میں تجربہ ہو جائے گا پھر فائدہ بھی ہوگا اور ادھر کی کمی بھی پوری ہو جائے گی۔ دل تھوڑا نہ کرو۔ جب خالی بیٹھو تو غور کرو کہ کس وجہ سے خریدار تم سے سودا لینا پسند نہیں کرتے جو نقص نظر آئے اسے نکال ڈالو۔

سنجھو۔ خاک غور کروں۔ حواس تو ٹھکانے نہیں۔ دکان کی حالت دیکھ دیکھ کر سٹی بھولی جاتی ہے۔ تم کہتی ہو کہ کچھ دنوں کے بعد تجربہ ہو جائے گا۔ قربان اس تجربے کے جب دکان خاک میں مل چکی تو تجربہ ہونے سے کیا حاصل۔ وہی مثل ہوئی کہ "مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد۔"

عقیلہ۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ کوئی سبب پیدا کر دے گا۔ وہ رازق العباد ہے۔ بندوں کو بھوکا اٹھاتا ہے بھوکا سلاتا نہیں۔ رحمن کو خدا رکھے بالکل ناسمجھ ہے۔ آٹھوں پہر گودی میں لٹکا رہتا ہے۔ اس لیے سلائی کے کام پر پوری توجہ نہیں کر سکتی۔ اللہ رکھے چار دن گھٹنیوں چلنے کے قابل ہوگا۔ وہ چار مٹی کے کھلونے سامنے ڈال دوں گی۔

وہ بیٹا کھیلا کرے گا اور ہم فراغت سے بیٹھ کر سیئیں گی، چلو گھر کا خرچ بندھ جائے گا۔ تمہیں کس بات کی فکر ہے؟ آخر ہمیشہ یہی دن تو نہیں رہیں گے کبھی تو تقدیر سیدھی ہو گی اُس وقت ان تکلیفوں کا نعم البدل ہو جائے گا۔

سنجیدہ: خوب ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جب تک تقدیر راستی پر آئے۔ ہم کہاں ہوں گے۔

عقیلہ: میں بھی سمجھتی ہوں کہ گھر کی فراغت کے ساتھ تمہاری عقل بھی جاتی رہی ہے، اتنا گھبرا گئے تو بنتا ہوا کام بھی بگڑ جائے گا۔ غور کرکے (خوب یاد آیا) میر حیدر علی کو تم جانتے ہو؟ وہی جو ابا جان مرحوم کی زندگی میں بہت آیا کرتے تھے۔ کئی مہینے بیمار رہے اس لیے آمد و رفت موقوف ہو گئی تھی۔ اب پانچ چھ روز سے پھر مغرب کی نماز پڑھ کے خبر سلا (خیر و عافیت) لینے چلے آتے ہیں۔ بڑے خدا ترس اور وضعدار آدمی ہیں۔ مجھے بیٹی کہا ہے تو بیٹی کی طرح ہی مانتے ہیں۔ بیس روپے پنشن ملتی ہے اسی میں گذر بسر کرتے ہیں۔ پہلے اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ سوداگری کی دکان خوب چلتی تھی لیکن بیوی اور لڑکی کے مر جانے سے کوئی آگے پیچھے نہ رہا۔ اکیلے دم کو بیس روپے کافی ہیں۔ ان دونوں موتوں کے تابڑ توڑ ہو جانے سے دماغ پر بہت برا اثر پڑا اور دکان اٹھا ڈالی۔ تمام دن خبطی بنے پڑے پھرتے تھے۔ اسی حالت میں بیمار ہو کے کھٹیا سے لگ گئے۔ خدا نے

دوبارہ زندگی کی۔ ایک روز پوچھتے ہوئے اُس کے گھر گئے تھے۔ وہاں جاکر سب حال سُنا۔ بیچارے افسوس کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں نے باہر بٹھایا۔ شادی ہونے کے بعد سے پردہ شروع ہوا تھا۔ اس لئے اندر نہیں بلایا۔ دیر تک بیٹھے ہوئے غم کرتے رہے۔ کئی دفعہ کہا کہ بیٹا! میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ کوئی ضرورت ہو تو کہو۔ تکلف کرنے یا شرمانے کی حاجت نہیں۔" تمہاری رائے ہو تو ان سے دکان کا کام درست کردینے کی التجا کروں؟ وہ سوداگری کے اصول سے خوب واقف ہیں۔ کیا عجب جو اُن کی سعی سے ہمارا بھلا ہو جائے۔

سنجھو۔ ضرور کہو۔ ان کی ہمدردی حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ ہمارا بگڑا ہوا نصیب بن سکے!

عقیلہ کے کہنے سے میر حیدر علی نے دکان پر بیٹھنا منظور کر لیا اور جمعہ کی نماز پڑھ کے سنجھو کے ساتھ گئے۔ مال کا حساب جو دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ تھوک فروشوں نے سنجھو کو ناواقف سمجھ کے خوب خوب مونڈا تھا۔ جس قیمت پر عام خریداروں کو مال دینا چاہیئے تھا وہی دام سنجھو سے وصول کئے تھے۔ اس پر منافع کی رقم جو اضافہ کی گئی تو پیسے کی چیز سوا پیسے کی ہو گئی۔ اس صورت میں خریداروں کا سودا خریدنا محال تھا۔ گرانفروشی کے علاوہ مال بھی خراب دیا تھا۔ مگر خریدے ہوئے دو مہینے سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا۔ اب واپسی کی کوشش یا قیمت میں کمی کرانا دشوار امر تھا۔ پھر بھی وہ سنجھو کو ساتھ لے کر تھوک فروشوں کے یہاں گئے۔ انہیں مال دکھا اور حساب سامنے رکھ کے بہت کچھ نرم و گرم

کہا بعض تاجر تو اپنی بد دیانتی سے شرمندہ ہوئے۔ مال بدل دیا اور قیمت بھی مناسب لگائی لیکن بعض ہٹ دھرم راضی نہ ہوئے

میر حیدر علی نے دو تین دن میں الٹ پلٹ کے دکان کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ اب خریدار آنے لگے اور سودا بھی بکنے لگا۔ جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی۔ میر صاحب سنجھو کو سمجھا بجھا کر بھیجتے تھے وہ جا کر مال خرید لاتا تھا۔ اس تدبیر سے اس کی واقفیت بڑھی اور تجارت کے اکثر اصولوں سے واقف ہو گیا۔ قرب و جوار کے میلوں، نمائشوں میں بھی میر صاحب کے ساتھ مال لے کر گیا۔ صحیح کوششوں نے قسمت کو بھی بدل دیا تھا۔ مال اچھے داموں فروخت ہوتا تھا اور وہ خاطر خواہ نفع حاصل کر کے واپس آتا تھا۔ دو ہی تین برس کے الٹ پھیر میں محنت اور جفاکشی کا پودا جما، بڑا ہوا، پھیلا اور اس کی شاخیں پھیل گئیں۔ اب سنجھو وہ سنجھو نہ تھا جو کس مپرسی کی طرح مصائب سے گھبرا کر سنکھیا پھانکنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ جو کتے بلّی کی موت کا طلب گار ہوتا تھا۔ جسے انتہائی کوشش کے بعد دس روپے کی ملازمت بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ آج اس کے فرم میں متعدد کلرک اور ایجنٹ کام کرتے ہیں۔ اس کی صائب الرائے زوجہ عالیشان محل میں عیش و آرام سے زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کا ایوان امیرانہ ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ نوکر چاکر، گاڑی گھوڑا، سائیکل موٹر الغرض خدا کا دیا سبھی کچھ موجود ہے۔ رحمٰن کی تعلیم و تربیت کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر ہے۔ وہ اکثر اپنے احباب سے فخریہ کہا کرتا ہے کہ مجھ کو اس عروج پر پہنچانے والے

خدا کے بعد دو اشخاص ہیں۔ اول عقیلہ دوم میر حیدر علی۔ اگر عقیلہ ان سخت و صعب اوقات میں اپنی تسلّی آمیز باتوں سے آڑے نہ آتی اور تسکین نہ دیتی تو مصیبتوں کا بڑھتا ہوا سیلاب مجھے ضرور ہلاک کر دیتا۔ وہی نیک بیوی تھی جس نے مجھے گمراہیوں سے محفوظ رکھا اور مفید مشورے دے دے کر شمع ہدایت بنی اور آخر کار اپنی انتھک کوششوں سے معراجِ ترقی پر پہنچا دیا ہے۔ اور میری نسل اس کاروبار سے جب تک فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ اس نیک محبت پرست اور فرزانہ خاتون کی ممنونِ احسان رہے گی ؛

ممتا

خدیجہ نہایت شریف النفس، نیک خصال اور پاک طینت خاتون تھی۔ بچپن کا زمانہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری میں بسر کرنے کے بعد عنفوان شباب میں شوہر کے سپرد کر دی گئی۔ وہ پیدائش کے دن سے محبت پرستی اور وفا کوشی کی عادی بنائی گئی تھی۔ اس نے شوہر کے گھر میں آ کے نہ صرف خانہ داری کے امور ہی کی دیکھ بھال کی بلکہ خلیق اور نازبردار شوہر کے دل پر بھی پورا پورا قابو حاصل کر لیا۔

رفیق کوئی بڑا امیر نہ تھا، اس کی حیثیت سو روپے ماہوار کی تھی جس میں جائداد کی آمدنی کے ساتھ آفس کی تنخواہ بھی شامل تھی۔ اس کا دستور تھا کہ مہینے کی پہلی تاریخ کل روپیہ لا کر خدیجہ کے حوالے کر دیتا تھا اور خدیجہ اس سے مہینہ بھر کا خرچ چلانے کے بعد کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتی تھی۔

جس گھر کے مالک اور مالکہ کی موافقت ہو وہ گھر جنت سے کم نہیں۔ میاں بیوی

کی زندگی بڑے آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ آنے والی صبحیں ان کے واسطے مسرت اور شادمانی کا تحفہ لاتی تھیں۔ روشن راتیں اُن کے کیف اور سرور میں غیر معمولی اضافہ کرتی ہوئی گزر جاتی تھیں اور وہ دونوں خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے لذت اندوز ہو کر زبان سپاس کھولتے تھے۔

(۲)

خدیجہ کی آدھی عمر عیش و آرام میں بسر ہو گئی۔ شوہر کی بے انتہا محبتوں اور ناز برداریوں نے میکے کی فراغت بھلا دی۔ اللہ کا دیا ہوا گھر میں سب ہی کچھ تھا۔ سو روپے بے سلیقے سے صرف ہونے کی وجہ سے ہزار روپے کے برابر ہو گئے تھے۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ در و دیوار سے شادمانیاں ٹپکی پڑتی تھیں۔ پھر بھی ایک خلش تھی جو میاں بیوی کے دلوں کو بے چین رکھتی تھی۔ جب دنیا کے کاموں سے فارغ ہو کر دونوں میاں بیوی بیٹھتے تھے۔ تو گھنٹوں اس خیال سے مغموم اور سرنگوں رہتے تھے۔ اس خلش کی وجہ یہ تھی کہ ہنوز خدیجہ کی گود خالی تھی۔ یوں تو گھر میں سب چیزیں موجود تھیں صرف کسر تھی تو ایک شمع کی تھی جو اُن کی آنکھوں میں نور اور دلوں میں حقیقی سرور کی لہریں پیدا کرتی۔ پڑوسیوں کے ننھے بچے اپنے مکان کے صحن میں کھیلنے کودنے اور پرجوش فعلیاں کرتے تھے۔ ان کے ماں باپ ان خوبصورت تتلیوں کے انوکھے کرشموں سے محظوظ ہوتے تھے لیکن خدیجہ اس نعمت سے محروم تھی۔ وہ صرف اس لالچ میں مٹھائی رکھ چھوڑتی تھی کہ شاید پڑوس کا کوئی بچہ کھیلتا ہوا آ نکلے اور وہ اُسے کلیجہ سے لگا کر دل ٹھنڈا کرے۔

(۳)

خدیجہ کی یہ تمنا پوری تو ہوئی لیکن کسی قدر تاخیر سے۔ جب اس کی عمر کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ چکا۔ اور اس نے اہل اللہ اور پیروں سے لو لگائی۔ ہزاروں منتیں مانیں۔ فقیر فقرا کی دعائیں لیں۔ ولیوں کے مزاروں پر جاروب کشی کی اور جس قدر تدبیریں امکان میں تھیں ان سب پر عمل کر چکی تو رحمتِ الٰہی جوش میں آئی۔ گو شیرۂ قلب سے نکلی ہوئی دعائیں بابِ اجابت تک پہنچیں۔ نہالِ عمر میں ثمر آیا۔ یعنی جب خدیجہ کا سن تیس اور چالیس سال کے درمیان میں تھا تو خدا نے ایک مہ پارہ فرزند عطا کیا۔ اس موقعہ پر ان دونوں کو جو خوشی حاصل ہوئی لفظوں میں اس کا اعادہ ممکن نہیں۔ رفیق تو ولادت کا مژدہ سنتے ہی سجدے میں گر پڑا۔ سارا گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ڈیوڑھیوں پر ڈومنیاں اتر رہی تھیں۔ اس خوشی میں قدیم رنجشیں بھی مٹ گئی تھیں۔ خاندان میں جن جن لوگوں سے ملال تھا۔ وہ بھی گذشتہ کدورتیں فراموش کر کے تہنیت دینے چلے آئے تھے۔ ان موقعوں پر جتنی مناسب خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ وہ سب تمام و کمال عمل میں لائی گئیں۔ بڑے چلے کے نہان تک عجب چہل پہل رہی۔ خاندان کے تمام چھوٹے بڑے مہمان رہے برادری کی ضیافتیں ہوئیں۔ اگرچہ رفیق رسموں کا حامی نہ تھا لیکن مستورات سے بس نہ چلا کچھ نہ کرنے پر بھی بیسیوں رسمیں ادا کی گئیں۔ کچھ اوپر ایک مہینہ شادی کا ہنگامہ گرم رہا پھر یکے بعد دیگرے مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے۔ آخر مکان میں میزبانوں کے سوا

کوئی نہ رہا ۔

(۴)

خدیجہ اور رفیق لختِ جگر کو دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ بچے سے ماں ممتا واری واری اور دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔ بچہ ٹھمکا اور دونوں کے کلیجے ہاتھ بھر کے ہو گئے۔ خدیجہ کو تو گویا بچے کی دیکھ بھال کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ اسے اتنی بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ دن کدھر آیا اور کدھر نکل گیا! رفیق نے بیوی کی سہولت کے خیال سے ایک کھلائی رکھ دی تھی لیکن وہ ممتا کے مارے بچے کے کل کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھی۔

زمانہ گزرتا رہا۔ جس طرح باغ کے نہالے باغبان کی آبیاری سے لہلہانے لگتے ہیں۔ بچہ اپنی جنت والی مہربان ماں کی غور و پرداخت سے نشو و نما پانے لگا۔ سال بھر کا بچہ باتیں تو کیا کرتا کچھ یونہی سی غوں غاں کرنے لگا تھا۔ اس کی معصومانہ ادائیں والدین کے لئے جانی مسرت کا باعث تھیں۔ کاش وہ سمجھ سکتے کہ خالقِ حقیقی نے جو امانت ان کے گھر میں ودیعت رکھی ہے۔ وہ بہت تھوڑے دنوں کے لئے ان کے ہاتھوں کا کھلونا گھر کا اُجالا اور دل کا سرور ہے۔

(۵)

گرمیوں کی فصل، آندھیوں کا زمانہ اور رات کا وقت تھا۔ رفیق اپنی ڈیوٹی پوری کر کے مکان آ گیا تھا۔ رات کے کھانے سے فراغت ہو گئی تھی۔ بچہ ماں باپ کی گود میں کھیل

کو دکر سو گیا تھا۔ خدیجہ نے اُسے جھپٹ سے بستر پر لٹا دیا اور تھوڑی دیر میاں سے باتوں میں مشغول رہی۔ گھنٹہ گھر سے دس بجنے کی آواز آئی۔ یہ دونوں بھی آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹ گئے۔ ماما اور کھلائی تو کھانا کھا کر نو ہی بجے سے غافل سو گئی تھیں۔ اب مکان میں بالکل سکوت تھا۔ انگنائی میں ایک طرف پھونس کا چھپر پڑا تھا۔ یہیں ماما گھر کا کھانا پکاتی تھی۔ ہونے اتفاق سے آج لکڑیاں بجھاتے وقت خیال نہ رہا اور ایک لکڑی جلتی رہ گئی۔ ایک بجے رات کو ہوا تیز ہو گئی۔ لکڑی سے کچھ پتنگے نکل کر پھونس تک پہنچ گئے۔ مئی جون کا مہینا ہے۔ چھپر بارود کی طرح جل اٹھا۔ شعلے بھڑک بھڑک کر آسمان تک جانے لگے مگر سونے والوں کی آنکھ نہ کھلی۔ اگر چھپر ہی پر بلا ٹل جاتی تو غنیمت تھا لیکن ان شعلوں نے یہ غضب ڈھایا کہ سارے مکان میں آگ لگا دی دفعتہً سب کمرے دھڑا دھڑ جلنے لگے۔ ایک تو گرمی اس پر آگ کی حرارت۔ سب سے پہلے رفیق بیدار ہوا۔ کب؟ جب موت کا فرشتہ کچھ ہستیوں کو خاکستر کرنے کی نیت سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی گھر کو آتش بازی کے قلعے کی طرح جلتے دیکھا۔ واقعہ سمجھ میں نہ آیا اور غور کرنے کی مہلت نہ تھی۔ فی الفور بیوی کا شانہ جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ عورت ذات اس ہولناک منظر کی تاب نہ لا سکی۔ ہوش و حواس گم ہو گئے۔ رفیق نے کہا:۔

"اُف! آگ کا اثر یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ جلدی گھر سے نکل چلو۔ ورنہ ہم سب جل بھن کر خاک ہو جائیں گے۔ خدیجہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رفیق آگے آگے ہوا

اور دونوں بدحواسی کے عالم میں مکان سے باہر نکل گئے۔ اب تک دونوں میں سے
کسی نے بھی بچے کو دریافت نہیں کیا تھا۔ رفیق نے سمجھا تھا کہ خدیجہ نے گود میں
اٹھا لیا ہوگا اور خدیجہ کا خیال تھا کہ رفیق پہلے جاگا تھا اس نے بچے کو محفوظ کر لیا ہوگا
اس کی جگہ پہنچ کر خدیجہ نے رفیق کی گود خالی پائی۔ جی سن سے ہوگیا۔ گھبرا کر پوچھا
"میرا بچہ کہاں ہے؟"

اس سوال نے رفیق کے استقلال پر کاری ضرب لگائی۔ مگر جواب کیا دیتا؟
وہ دونوں اپنی ننھی سی جان کو موت کے منہ میں چھوڑ آئے تھے۔ دونوں بجائے خود
مجرم تھے۔ بڑھتے ہوئے سکوت نے حقیقت فاش کر دی۔ ماں کا دل تھا۔ تاب نہ رہی
بچے کے لانے کو دیوانہ وار چیختے ہوئے گھر کی طرف لپکی۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں نے
صف بندی کر کے روکنا چاہا۔ موت کی ہیبت عناں گیر ہوئی۔ لیکن جانباز پروانے
کو شمع کی لو تک پہنچنے سے کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ اسے کوئی پر زور کشش
کھینچے لیے جاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ رکنا بھی چاہتی تو نہ رک سکتی۔

(۶)

رفیق کئی منٹ تک دم بخود رہا۔ جب خدیجہ شعلوں کے قریب پہنچ گئی۔ تو
بڑی بیتابی سے یہ کہتا ہوا جھپٹا۔

"ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ میں آتا ہوں۔ تم خطرے کی جگہ نہ جاؤ۔"

بچے کی مامتا نے یہ الفاظ اس کے کانوں تک نہ پہنچنے دیئے۔ وہ جو ہمیشہ

شوہر کے جملہ احکام پر سرِ اطاعت خم کرنے کی خوگر رہی ہے۔ اس وقت میاں کی طرف پھر کے بھی نہیں دیکھتی! اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے بچے کی مامتا نے کلیجے میں آگ بھڑکا رکھی ہے۔ اس آنچ کے سامنے ان شعلوں کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ رفیق چیختا چلاتا رہا لیکن وہ شعلوں کے اندر گھستی چلی گئی اور سیدھی اس خواب گاہ میں پہنچی جہاں اس کا نونہال طفلانہ نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ آگ کی گرمی نے پیاری پیاری نازک جبین کو عرق آلود کر دیا تھا۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا کر اس کے پھول سے رخسار چومے اور کلیجے سے چمٹائے ہوئے کمرے سے نکلنا چاہا۔ دروازے ہی پر رفیق بھی مل گیا، جو اپنی جان پر کھیل کر اس کی مدد کے لئے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ چھت میں آگ لگی تھی۔ دھنیاں۔ چھانیں، کھڑکیاں اور دروازے جل رہے تھے۔ دیواروں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اور گویا ایک اجل رسیدہ خاندان کو آتشیں غسل دینے میں کمال کدوکاوش کر رہے تھے۔ دھواں گھٹنے کی وجہ سے راستہ نہ ملتا تھا۔ جدھر قدم بڑھتا تھا، لپکتے ہوئے شعلے سدِ راہ ہوتے تھے۔ وہ دونوں کئی دفعہ بھاگ کر اِدھر سے اُدھر، اِدھر سے اُدھر آئے گئے لیکن نکاس کی صورت پیدا نہ ہوئی ان کا وقت پورا اور حکمِ قضا نافذ ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھنیاں اور چھانیں جل جل کر گریں۔ ساتھ ہی الڑا اڑا کر چھت بھی آ رہی اور آن کی آن میں یہ تینوں ناشاد اور پرارمان ہستیاں جل بھن کر خاکستر ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؛

عید

(۱)

جبکہ سارا شہر عید کی تیاری میں مصروف تھا۔ گھر گھر خوشی منائی جا رہی تھی، ایک کم نصیب خاندان ایسا بھی تھا۔ جسے زمانے کے بے مہر ہاتھوں نے اس بے انتہا سرور اور خرمی سے محروم کر رکھا تھا۔ پڑوس سے شادمانی کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔ بچے نئے نئے لباس اور دودھ سیویوں کی ترنگ میں خوش رنگ تتلیوں کی طرح چمکتے پھرتے تھے۔ لیکن بد نصیب قریشیہ کی جھونپڑی سے آہ جگر سوز کا دھواں اٹھ اٹھ کر فضا کو تاریک کر رہا تھا۔ اس کا نادان بچہ صاف کپڑوں کے واسطے ضد کر رہا تھا۔ ہمسنوں کو دکھاتے پیتے دیکھ دیکھ کر بھوک بھوک پکار رہا تھا۔ مصیبت کی ماری ماں، فاقہ کش معصوم کے لئے کوئی انتظام نہ کر سکتی تھی۔

قریشیہ کو یقین تھا کہ آج سلیم کسی نہ کسی طرح اتنا ضرور کما لائیگا جس سے

بچہ، میاں اور بیوی چنے بھنا کر فاقہ شکنی کر سکیں۔ آہ! بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ جس عید نے تمام گھروں کو کاشانۂ مسرت بنا رکھا ہے۔ وہی عید اِن کی جھونپڑی میں تازہ مصیبت بن کر داخل ہوئی ہے۔ وہ نادان اور ناسمجھ بچے کو یہ کہہ کر بہلا رہی تھی کہ "میرے لال! رو رو کے جان ہلکان نہ کر۔ تیرا باپ بازار گیا ہے، وہاں سے پہننے کو نئے کپڑے اور کھانے کو دودھ سویاں اور اچھی اچھی مٹھائیاں لاتا ہوگا۔" بچے کے دل کو ڈھارس ہو گئی۔ وہ موہوم امید کو کلیجے سے لگائے ہوئے سو گیا اور غمزدہ قریشہ، میاں کے انتظار میں دروازے سے ٹکٹکی لگا کے بیٹھ رہی۔ اُس کے سامنے بھولا بھالا معصوم بچہ فرشِ زمین پر پڑا تھا، پھول سے نیٹڈے پر پرانے چیتھڑے تھے۔ اس کے دل سے ——— بے چین اور بے قرار دل سے فلاح و بہبود کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ مغموم آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے تھے۔ مصیبتوں نے سموم زدہ گلاب کی طرح حسین چہرے کو کملا دیا تھا۔ کئی وقت گزر چکے تھے کہ ایک کھیل بھی اُڑ کر منہ تک نہ گئی تھی۔ مگر اُسے بھوک کا مطلق احساس نہ تھا۔ وہ اُن نیک بندیوں میں تھی جو پانی پی کر خدا کا شکر ادا کرتی ہیں اور مصیبت و ابتلا میں زبانِ سپاس پر شکوہ نہیں لاتیں۔ البتہ معصوم بچے کی تکلیفوں کا خیال روح کو بے چین کر رہا تھا۔

(۲)

تمام دن عید کی دھوم مچی رہی۔ فضا مسرت کے نعروں سے گونجا کی۔ قریشہ کی جھونپڑی کے سوا شہر کے کُل مکانات بیت السرور بنے ہوئے تھے۔ انہیں

حالات میں شام کا جھٹپٹا پھیلنے لگا۔ عید کے روز کو چمکانے والا آفتاب ڈھلتے ڈھلتے سراپردۂ مغرب کے قریب پہنچ گیا۔ عید کے سرور سے خوش فعلیاں کرنے والے نونہال، دن بھر کی چہلوں سے تھک کر گہوارۂ راحت میں آسودہ ہو گئے۔ پرشور فضا میں پُرامن سکون پیدا ہو چلا لیکن بیکس و ناشاد قریشہ کے دل کا اضطراب تخفیف کی طرف مائل نہ ہوا۔ تمام گھروں میں گھرداری کا دھندا شروع ہوا۔ چولھوں میں آگ پڑی۔ لکڑیوں کا دھواں زلف پیچاں کی طرح خم بخم بلند ہونے لگا۔ لیکن قریشہ کی جھونپڑی ویران ہی رہی۔ وہاں سے ایندھن جلنے کے بدلے دل سلگنے کے بخارات نکل رہے تھے۔ شہر کے مکانوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں چراغوں کی روشنی سے نور کا عالم طاری ہوا اور قریشہ کے ظلمت کدہ میں دل کے داغ جگمگانے لگے۔ جن کی شعاعیں ان بدنصیبوں کے سوا کسی کو محسوس نہ ہوئیں۔

دن بھر کا تھکا ہارا سلیم رات کے اندھیرے میں مکان واپس آیا۔ وہ فاقہ زدہ بچے اور مصیبت کی ماری بیوی کے لئے صبح سے شام تک شہر کی بازاروں میں خاک چھانتا پھرا۔ مگر عید کی گہما گہمی نے عیش و سرور کے سوا کل کاروبار کو بند کرا دیا تھا۔ سارے دن کی جدوجہد کے بعد کہیں چار پیسے کی بھی مزدوری نہ لگی کہ رات کو بچہ اور میاں بیوی چبینا چاب کر پانی پیتے اور رازق العباد کا شکر بجالاتے۔ وہ انتہائے مایوسی کے ساتھ گھر آیا۔ اگرچہ اس کا دل اطمینان اور فراغبالی کے ارمانوں سے پُر تھا لیکن خاطرِ مایوس کی طرح دونوں ہاتھ خالی تھے۔

قریشہ انتظار کے سخت و صعب گھنٹے گن گن کر بسر کر رہی تھی سلیم کی واپسی میں جتنی تاخیر ہوتی اس کی امیدیں قوی سے قوی تر ہوتی جاتیں۔ چراغ جلنے کے بعد اُسے یقین ہو گیا کہ آج ضرور کہیں کام لگ گیا یا نوکری مل گئی ہے۔ اسی سبب سے واپسی میں دیر ہوئی ہے۔ اب میرا بچہ روکھے سوکھے ٹکڑوں کے لئے نہ ترسے گا۔ آہ! ستم نصیب کو کیا خبر تھی کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی تقدیر میں مایوسی ہی بدی ہے!

یکایک جھونپڑی کے دروازے پر پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ امید و بیم کے مخلوط اثرات سے قریشہ کا دل اچھلنے لگا۔ آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھل کر دروازے پر جا لگیں۔ اور وہ ایک ولولے کے باعث بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے سلیم اپنی شکستہ صورت لئے ہوئے جھونپڑی میں داخل ہوا اور خاموش تھا —— بالکل خاموش! قریشہ اس کی زبان سے ملازمت کا مژدہ سننے کی منتظر تھی۔ دونوں آنکھیں فرطِ اشتیاق سے میاں کی مایوس صورت پر جمی تھیں۔ کئی لمحوں تک بالکل سکوت رہا۔ آخر ایک دل خراش آہ کے ساتھ سلیم نے دن بھر کی روداد کہہ سنائی۔ دکھیا عورت کے ٹوٹے ہوئے دل سے آہ نکلی شمشیرِ یاس نے مجروح کلیجے پر ضرب لگائی۔ اور وہ بے ہوش ہو کر فاقہ نصیب بچے کے پہلو میں گر پڑی۔

اُسی شب کو جب کائنات پر رات کا سناٹا مسلط تھا۔ سارا عالم خوابِ استراحت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اُس نے خالقِ بے نیاز کی بارگاہ میں سر جھکا کر رجوعِ قلب کے ساتھ مصیبت کے انقطاع اور سلیم کی دولتمندی کے لئے دعا کی۔ التجا کرتے

وقت اس کی دونوں آنکھیں خاص کے موتی بچھاور کر رہی تھیں جن کی قیمت قدرت کے خزانے کے سوا کہیں نہیں مل سکتی۔ دعا کے بعد دل ہلکا ہو گیا۔ غیبی آواز نے قبول کی بشارت دی اور وہ مطمئن ہو کر سو گئی :

(۲۳)

تقدیر ہر ایک کو ایک زریں موقعہ عنایت کرتی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا نہ ہو گا جسے کبھی نہ کبھی عروسِ علیتی کی آغوش نصیب نہ ہوئی ہو۔ لیکن ہوشمندوں نے ان اتفاقات سے دائمی فائدہ حاصل کیا اور نادان محروم رہ گئے۔

تسلیم کے باغِ زندگانی میں بھی نسیم بہار کا نشاط انگیز جھونکا آہی گیا۔ اس کا دولتمند اور لاولد چچا لاکھوں کی جائداد اور املاک چھوڑ کر چل بسا اور سارے کا سارا متروکہ تسلیم کے حصے میں آیا۔ اٹارنی نے ٹیلی گرام بھیج کر اطلاع دی۔ دولتمند کی وراثت حصولِ قرض کو کافی تھی۔ وہ قرض دام لے کر بیوی بچے سمیت چل کھڑا ہوا۔ اٹارنی سے مل کر میراث حاصل کی اور دلقِ گدائی اتار کر امیرانہ لباس پہن لیا۔

اب تسلیم وہ تسلیم نہیں جو نانِ شبینہ کے لئے ترستا تھا۔ جسے سارا سارا دن بازاروں کی خاک چھاننے کے بعد چار پیسے بھی نہ ملتے تھے کہ پانی پینے کا سہارا ہوتا۔ اب اُس کے دسترخوان پر الوانِ نعمت حاضر ہیں۔ آراستہ و پیراستہ محل سکونت کو موجود ہے۔ لباسِ فاخرہ سے الماریاں بھری پڑی ہیں۔ اصطبل میں نفیس نفیس موٹر کاریں تیار رہتی ہیں۔ اب اکلوتا بچہ اچھے کپڑوں اور خوبصورت کھلونوں کو نہیں ترستا۔ بیوی

سر سے پاؤں تک جواہرات میں لدی رہتی ہے۔ دنیا کا تمام عیش اس کے قدموں سے لگا ہے۔ قدرت نے تلافی مافات کا سنہری موقعہ عطا کر دیا ہے اور وہ آنکھیں بند کیے ہوئے عیش و سرور کے سیلاب میں بہا چلا جاتا ہے۔

قمر لبشہ کی دعائے نیم شبی مقبول ہوئی۔ خدائے قادر و توانا نے اس کی مصیبت دور کر دی۔ اب تسلیم کا شہر کے عمائد میں شمار ہے۔ نوکروں چاکروں کی کمی نہیں۔ آرام اور آسائش کی تمام چیزیں موجود ہیں لیکن اس کی روحانی آسائشوں کا سورج غم و اندوہ کے دریا میں ڈوب گیا ہے۔ اُس کے حسین و نازک جسم پر ریشمی لباس زیب دیتے ہیں۔ خوبصورت اور متناسب اعضاء الماس و گوہر کے زیورات سے ضو فشاں ہیں مگر سینے کے اندر رہنے والے دل کو راحت اور فراغت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ اس دور افلاس اور عہدِ ابتلا کو یاد کرتی ہے جب زیور تو زیور سنہری پتی کو ناہنت چلبلاتی تھی۔ ابھی نہ جڑا تا تھا۔ تین تین کڑاکے کے فاقے گذر جاتے تھے۔ کلیجے کا ٹکڑا، معصوم بچہ، ہر چیز کو ترسا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن میاں کا سچا پیار، خالص دلجوئی اور حقیقی ہمدردی جملہ مصائب کا نعم البدل ہو جاتی تھی۔ بیکسی اور بیچارگی کے عالم میں مصیبت کی تیرہ و تار طویل راتوں میں اور آلامِ ارضی و سماوی کے بھیانک اندھیرے میں، بیوی میاں کی اور میاں بیوی کی تسلّی و تشفّی میں مصروف رہتے تھے۔ باہمی ہمدردی ساری تکلیفوں کا ازالہ کر دیتی تھی۔ آہ! وہ سچی محبت سے بھرا ہوا مصیبت کا دور گزر گیا وہ ڈراؤنی راتوں کی ہمدردیاں دولت کی تیز روشنی میں فنا ہو گئیں۔ زر کے نشہ نے محبت

کے نمار کو بھی باقی نہ رکھا۔ بے نصیب قریشیہ میاں کی ایک جنبشِ التفات کو ترسا کرتی ہے۔ لیکن سلیم غلط انداز نگاہ سے سرفراز کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ زیادہ تر وہ اپنے نفس کی خواہشیں پوری کرنے میں مصروف ہے۔

عاقبت اندیشی اور غفلت کا اجتماع ممکن نہیں۔ ہر شخص فراغت کے دور میں اپنے افعال کا مختار ہے۔ اس کا طرزِ عمل تاریک اور روشن راہوں میں سے کسی ایک راستے پر لگا دے گا اور وہ انجام کار اُسی منزل پر پہنچ جائے گا جو دانائی یا نادانی سے اپنے لئے منتخب کر لی ہے۔ سلیم بھی یارانِ طریقت کی چکنی چپڑی باتوں میں پڑ کر گمراہ ہو گیا۔ روشنی چھوڑ کر ظلمت میں جا پھنسا۔ خدائے کارساز کی شکر گزاری کے بدلے کفرانِ نعمت کو شعار بنایا۔ اپنا عیش محل اجاڑ کر عصمت فروش ناز نینوں کے کمرے آباد کئے۔ قدرت نے گھر کو رشکِ فردوس بنانے کے لئے قریشیہ کے قالب میں جنت کی حور عطا کی تھی۔ لیکن اس نے آنکھوں پر غفلت کی پٹی باندھ کر دوزخ کی قمریوں سے ناطہ جوڑا۔ بیوی کی محبت کے پیام وصول ہوتے ہیں لیکن بازاری عورتوں کی نازبرداری قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ بچہ نمونیہ میں مبتلا ہے۔ علالت کے بستر پر پڑا ہوا الٹی الٹی سانسیں لے رہا ہے۔ وفادار اور نمک حلال خادم گھڑی گھڑی کی خبریں گوش گزار کرتے ہیں لیکن زر پرستوں کا ظاہری اخلاص بیمارداری کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا۔

ڈاکٹر ——— وہ ڈاکٹر جو بارہا سچی دوستی کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ اب طوائف کے گھر جانے کا ننگ گوارا کرتا ہے۔ اسے اپنی خالص دوستی پر اعتماد ہے۔ وہ خلوص اور

پند کے چلتے ہوئے جادو سے بھولے بھٹکے مسافر کو سیدھا راستہ دکھانے کی سعی !
ـــــ لاحاصل سعی کرتا ہے۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی۔

تسلیم !ـــــ شراب غفلت کا متوالا تسلیم۔ نشۂ صہبا سے مست و لایعقل ہو کے اس محبّ صادق کی توہین و تذلیل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مروّت قطع کرتے ہوئے زبانی جاں نثاروں کی مدد سے دھکے دے کر کمرے کے نیچے اتار دیتا ہے۔ ڈاکٹر اس کی اندھی عقل پر کفِ افسوس ملتا ہوا بے نیل مرام پلٹ آتا ہے۔ آہ! وہ خاموش ہے ساکت و صامت ہے۔ زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا۔ قریشیہ !ـــــ شوہر پرست اور وفادار قریشہ جسے دین و دنیا کی بہن بنایا ہے۔ جو غافل اور بے پروا شوہر کے مکان تشریف لانے کا مژدہ سننے کو بیتاب و بے قرار ہے جس کی روح افراط شوق سے کھنچ کر کانوں میں سمٹ آتی ہے۔ اس سے کیا کہے؟ کیا وہ اس غم آلود روداد کو سن کر متحمل ہو سکتی ہے؟ ڈاکٹر نے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد دل نشین جملوں میں صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہوئے کل ماجرا بیان کر دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ مقدور بھر اس کے نونہال کو موت کے سخت چنگل سے چھڑانے کی کوشش کی جائے گی۔ باپ کی غفلت سے کیا ہوتا ہے۔ خدا کو غافل نہ ہونا چاہیئے۔ وہ تمہاری گود خالی نہ کرے گا۔ تسلیم دولت پا کے اپنے آپ کو بھول گیا ہے۔ مگر وقت آ رہا ہے جب زمانہ اس کو پہچنوا دے گا۔ وہ آنکھیں کھول کر دنیا اور دنیا والوں کو دیکھے گا۔ دوست اور دشمن میں امتیاز کرے گا۔ نیک و بد سمجھے گا اور اپنے مذموم افعال پر منفعل ہوگا۔

نزیب قربانیہ کیا کرتی۔ اس کا زور ہی کیا تھا۔ سچ ہے مجبوری کا نام شکر ہے اور
بےبسی کو صبر و تحمل کہتے ہیں۔ دل لہو بن کے آنکھوں میں آتا رہا لیکن ساری کے
آنچل سے چشم پُر آب کی نمی خشک کر لی گئی ::

(۵)

طلسم فریب کو شکست لازم ہے۔ نشہ کے بعد خمار ضرور ہوتا ہے۔ فطرت معاف
نہیں کرتی۔ تسلیم بحر سرور کی جن موجوں میں جھکورے لیتا ہوا بہہ رہا تھا وہ ساحل کے
قریب پہنچ گئیں۔ دولت چگنے والی چڑیاں دولت چگ کر پرواز پر مائل ہونے لگیں۔
نقدی ختم ہو گئی لیکن قرض کی بدولت روزانہ کے تعیش میں کمی محسوس نہ ہوئی۔ ادھار
کا دروازہ بند ہوا تو جواہرات کا بکس چرایا گیا۔ مختصر یہ ہے کہ دنیا کے مال میں سے
ایک حبہ بھی باقی نہ رہا جو شب زندہ دار گل رخوں کی کافر اداؤں پر قربان کیا جا سکتا۔

محبت کا نشہ اتر گیا اب خمار کی باری ہے۔ ظاہر نما دوستوں نے آنے جانے
میں کمی کر دی۔ معشوقہ طناز جس کی ہوش ربا اداؤں پر جان کے سوا سب کچھ نثار
کر دیا تھا۔ وہ جسے معشوق ہونے پر بھی عشق کا دعویٰ تھا۔ جسے تسلیم کی گھڑی بھر کی
مفارقت جاں بلب کر دینے کو کافی تھی۔ اب وہ کبھی کبھی پرسان حال نظر آتا ہے؟ اس میں
اب وہ جانستاں ادائیں اور دل فریب عشوے دکھائی نہیں دیتے جو اپنے سرور میں
ہر وقت مدہوش رکھتے تھے۔ نہیں تو تحمیل الم یہ سامنے وہ تبسم نظر نہیں آتا۔ جو صبر و
شکیب کے خرمن کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اگرچہ عارض گلفام اب بھی غازے کے

مرہون ہوتے ہیں لیکن سلیم کے لئے نہیں۔ کاکل مشکیں شانے کی رہین ہوتی ہیں لیکن سلیم کے لئے نہیں۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائی جاتی ہے لیکن سلیم کے لئے نہیں۔ سلیم ان تمام دل آویز اور فتنہ خیز نظاروں سے قطعی محروم کر دیا گیا ہے۔ اس سے محبت کے بدلے نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے منہ لگا کر بات کرنا بدترین معصیت سمجھا جاتا ہے۔ وہ سجی سجائی خواب گاہ سے نکال کر تنگ و تاریک اور متعفن کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا ہے۔ جہاں مسہری تو مسہری بانس کی کھٹیا تک موجود نہیں ہے۔ مخملی گدے تو اس کے نصیب سے اڑ ہی گئے ہیں۔ اب مرہٹنے کو کھجور کی چٹائی اس کے حوالے کر دی گئی ہے؟

بد نصیب سلیم کہاں جائے۔ زمین مدعی ہے آسمان دشمن۔ محل نیلام ہو چکا ہے۔ سامان بک گیا ہے۔ بیوی بچے ڈاکٹر کے رحم و کرم پر اس کے گھر میں پڑے زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں۔ آہ! وہی ڈاکٹر جسے بڑی بے عزتی کے ساتھ طوائف کے کمرے سے اٹھوایا تھا جس کے نیک مشوروں کو التفات کے قابل نہ سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ کیا وہاں جا کے رحم کی التجا کرے؟ ہرگز نہیں۔ یہ حقیر اور نحس صورت اس کے دکھلانے کے قابل نہیں ہے۔ پھر طوائف کے گھر کی ذلیل زندگی اختیار کی جائے؟ ممکن نہیں وہ دن میں سینکڑوں دفعہ نکل جانے کا حکم نافذ کرتی ہے۔ وہ عنقریب لفنگے خادموں سے دھکے دے کر نکلوا دے گی۔

سلیم کا یہ اندیشہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ اکتسابِ زر کی راہیں قطعی طور پر

بند ہو چکی تھیں۔ خالی کیسہ میں نقرئی اور طلائی سکوں کی ایمان شکن کھنک موجود نہ تھی۔ جب زر ہی نہ رہا تو سلیم کیوں رہے؟ آخر ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ وہی عاشق نما محبوب جو کبھی روح کی راحت تھا' جان کا وبال بن گیا اور سلیم پابدستِ دیگرے دست بدستِ دیگرے کمرے سے اتار دیا گیا:

(۶)

عید کی پرسرور آمد نے مردہ دلوں میں عیش و نشاط کی روح پھونک دی ہے۔ اسلامی دنیا میں شادمانی کا غلغلہ بلند ہے۔ گھروں میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں لیکن بدنصیب سلیم سرمایہ سر برہنہ پا گریباں دریدہ' افراطِ قلق سے دیوانوں کی طرح روتا پیٹتا خاک اڑاتا دریا کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اقبال مندوں کی نظروں میں دنیا کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ اس کی آنکھوں کو تو بدہیئت اور کریہہ منظر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے عیش کا دامن اسی خارزار میں پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ صحنِ عالم میں' عافیت کا سکون آفریں چہرہ نظر نہیں آتا۔ ہاں آبِ رواں کی چادر ہی ایسی چادر ہے۔ جو اپنی پناہ میں لے کر روحانی آلام سے بچا سکتی ہے۔ وہ جوش میں گھبرایا ہوا بھاگوں بھاگ چلا جاتا ہے۔

دنیا اُس کے حال سے بے خبر ہے۔ عید کی شادمانیوں نے بدبختوں کی یاد کو بالکل فراموش کر دیا ہے صرف وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنے گوبند سے چھوڑ رکھے ہیں۔ جو سلیم کے افعال پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ان کی بھیجی ہوئی خبر پہنچایا کرتے ہیں۔ ان کی آخری اطلاع نے ڈاکٹر اور ذکیہ کو بد حواس کر دیا۔ وہ ایک سیکنڈ بھی

خدا حافظ کہے بغیر دریا کی طرف روانہ ہو گئے۔ اگرچہ ان کی موٹر کار ہوا سے باتیں کر رہی تھی لیکن انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مشین نے اپنا فعل ترک کر دیا ہے اور پہیے منجمد ہو گئے ہیں۔ وہ بار بار شوفر کو تیز چلنے کی تاکید کر رہے ہیں۔ یکایک دور سے سواد بحر نظر آیا۔ دریا کا نیلگوں پانی مستانہ روش کے ساتھ ہوا کی فرحت انگیز چھیڑ چھاڑ سے بہہ رہا تھا چھوٹی بڑی لہریں کسی پابوسِ جسم و جاں کا خیر مقدم کرنے کو کنارے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

فرلینہ نے دور سے ایک دیوانے کو ساحل کی طرف بڑھتے دیکھا ہر چند ظاہری آنکھیں شناخت کرنے سے عاری تھیں لیکن دیدۂ دل نے اپنے مطلوب کو فی الفور پہچان لیا۔ موٹر کار آگے بڑھنے سے مجبور تھی اسے راستے کی ناہمواری سدِ راہ ہوئی۔ ڈاکٹر اور فرلینہ کار سے پھاند پڑے اور مخبوط الحواس سلیم کی طرف بے تحاشہ دوڑے عقب میں دو تین پیرک بھی تھے جو احتیاطاً ساتھ لائے گئے تھے۔ ابھی ساحل ایک فرلانگ پر تھا کہ دیوانے نے اپنے آپ کو دریا کی بے چین اور مشتاق موجوں کے حوالے کر دیا فرلینہ کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور ساتھ ہی غش کھا کر ریت پر گر پڑی:

(۷)

سلیم ڈاکٹر کے مکان میں مقیم ہے۔ ڈاکٹر نے اپنی سچی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ اور اس کی فرشتہ خصال بیوی سلیم فرلینہ اور اس کے پیارے بچے کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ ان کے واسطے عیش و آرام کا جملہ سامان فراہم کرتے رہتے

ہیں۔ دلجوئی اور دلداری کا کوئی طریقہ فروگذاشت نہیں کرتے لیکن اب سلیم کے عقلی قوٰی دولت کے نشہ کا اثر دفع کرنے کے بجائے پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں۔ اس کی حمیت گوارا نہیں کرتی کہ زیادہ دنوں تک اپنے مصارف کا بار ڈاکٹر پر ڈالے رہے۔

اس نے عزیز ترین اور دفادار ترین رفیقہ سے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا

"خدائے قدوس کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہمارا امتحان ختم ہو گیا اب مجھے تو امیرانہ زندگی سے کوئی ثمر ہاتھ نہ لگا۔ اس سے تو وہی مصیبت اور افلاس کی زندگی بہتر تھی۔ خدا نے چاہا تو اب ساری عمر دولت مندی کا خواب دیکھنے کی ہوس نہ کروں گا ہم جیسے پیشتر تھے۔ پھر ویسے ہی ہو گئے۔ اس لئے ہمیں اللہ بزرگ و برتر کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ اب ہم لوگ خالص محبت اور حقیقی فراغت سے بسر کر سکتے ہیں۔ میری صحت رفتہ عود کر آئی ہے۔ کل سے معاش کی فکر میں نکلوں گا۔ اپنی غریبانہ کمائی تمہارے ہاتھ میں دوں گا تم اسے سلیقے سے صرف کرو گی اور ہماری جھونپڑی ہمارے لئے جنت بن جائے گی۔"

یکایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر اپنی بیوی کے ساتھ یہ کہتا ہوا اندر داخل ہوا!

"سلیم! تمہارا محل اب بھی باقی ہے۔ جھونپڑی کیسی؟ اگرچہ تم نے بہت کچھ اڑا دیا لیکن اب بھی امیرانہ بسر کر سکتے ہو"

سلیم (حیرت سے) کیونکر؟

ڈاکٹر (جواہرات کا بڑا بکس دکھا کر) یہ جواہرات تمہاری امانت ہے جسے میں

نے مآل اندیشی کے طور پر تمہارے بزازوں سے ساز باز کر کے اڑوا لیا تھا۔ تم نے نلوالعف کو جو جواہرات دیئے وہ نقلی تھے۔ میں نے کچھ نگینے فروخت کر کے تمہاری کوٹھی اور اس کا فرنیچر خرید لیا ہے۔ وہ اسی طرح سجی سجائی ہوئی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

سلیم ممنونیت کے جذبے سے بت بن گیا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ لیکن اس کی شکر گذار نظروں نے احسان مندی کا مظاہرہ کرنے میں کوئی قصور نہ کیا۔

کشتۂ ناکامی

(۱)

تھوڑا عرصہ ہوا کہ کنگ اسپتال میں ایک سِل کا مریض داخل ہوا جس کا سرمایۂ حیات ختم ہو چکا تھا اور جو تھوڑی بہت سانسیں باقی تھیں وہ بھی نہایت کرب و بے چینی کے ساتھ جلد جلد ختم ہو رہی تھیں۔

اسپتالوں میں علی العموم روزانہ مریضوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے اور تیمارداری کرنے والوں کو ادائے فرائض کے سوا اُن سے کوئی خاص ہمدردی نہیں ہوتی لیکن معلوم کیا بات تھی کہ مجھے غیر معمولی طور پر اس مریض کے ساتھ ہمدردی ہو گئی۔ ڈاکٹروں کی رائے میں اس کا بچ جانا عقل سے دور اور محالات میں تھا۔ عارضہ اپنا فرض ادا کر چکا تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑے سڑ چکے تھے۔ کھنکھار کے ساتھ منہ سے ڈھیروں خون گرتا تھا۔ کھانسی اس شدت سے تھی کہ بیچارے کو تکیہ پر سر رکھنا محال تھا۔ لاغری

نے ہڈی چمڑے کے سوا گوشت کا نام و نشان نہ رکھا تھا۔ جب دورہ اُٹھتا تھا۔ تو معلوم ہوتا تھا اس کی جان نکل رہی ہے۔ شام کو صبح ہونے کی امید نہیں اور صبح کو شام لانے سے یاس تھی۔ پھر کوئی مخفی طاقت مجھے اپنی پوری کوشش صرف کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ مجھے جتنا وقت آرام کرنے کو دیا جاتا تھا۔ وہ بھی کمال ذوق و شوق کے ساتھ اس مریض کی ہمدردی اور تیمارداری میں صرف کرتا تھا۔

خدا جانے دوا کا اثر تھا یا میری بے انتہا آرام رسانی کی تاثیر تھی کہ مریض نے آٹھ روز کاٹ دیئے! ہر چند اس کی تکلیفوں میں مطلق کمی نہ تھی مگر یہ فائدہ ہی غنیمت تھا کہ روز افزوں مرض ایک حال پر قائم ہو گیا۔ گویا میری بے انتہا محنت و جانفشانی کا صلہ تھا جو بارگاہِ قضا و قدر سے مل رہا تھا۔

(۲)

ان آٹھ روز میں کم سے کم آٹھ سو دفعہ میرے دل نے یہ خواہش کی کہ میں اس جاں بلب مریض سے اس کی زندگی کے حالات اور اپنی غیر معمولی ہمدردی کی وجہ معلوم کروں میں حیران تھا کہ آخر میرا دل بار بار کیوں مجبور کرتا ہے؟ حیرانی کی پُر زور وجہ یہ تھی۔ کہ روزانہ نئے نئے مریضوں اور ان کی بے چینیوں کے معائنے سے علی العموم ہم لوگوں (تیمارداروں) کے قلب سخت اور بے پروا ہو جاتے ہیں۔ درد اور سوزش سے کراہتے والے مریضوں کی المناک اور اندوہگیں آوازیں ہمارے دلوں میں کوئی حس پیدا نہیں کر سکتیں پھر بھی اس نیم مردہ مریض کی حالت میری توجہ کو اپنی جانب مائل کر

رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کہربا کاہ کو یا مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے!

ایک رات جب سارے اسپتال میں قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جن بیماروں کو درد نے بیتاب کر رکھا تھا۔ انہیں بھی نیند کی دوا دے کر غافل کر دیا گیا تھا۔ تیماردار بھی آرام لینے اور تھکے ہوئے جسموں کی راحت رسانی میں مشغول تھے۔ میں! —— اور صرف میں تھا جو اپنے مریض کی پٹی کے پاس سر ٹیکائے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔ نگاہیں بیمار کے مردنی چھائے ہوئے چہرہ پر جمی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا اس پیکر نحیف کے چہرے سے آہستہ آہستہ حیات کا رنگ و روغن اڑ رہا ہے۔

ادھر کلارک نے ڈیڑھ کا ڈنکا بجایا اور ادھر مریض کی کھانسی کا دورہ شروع ہوا اور ایسا تانتا بندھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ عنقریب اس کا تار نفس ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا میں نے کمال بے چینی اور اضطراب کی حالت میں دوا کی شیشی اٹھائی۔ ایک خوراک انڈیل کر اس نے نیم جان کے لبوں سے گلاس لگا دیا۔

آٹھ روز کے تجربے نے اسے باور کرا دیا تھا کہ میں خالصاً لوجہ اللہ اس کا خیر خواہ ہوں۔ اگرچہ اس حالت میں دوا پینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اچھو ہو جانے کا ڈر لگا ہوا تھا لیکن نہ مجھے سوچنے سمجھنے کا ذہن تھا نہ اسے تامل کرنے کا موقع۔ دوا نے حلق سے اترتے ہی اکسیر کا کام کیا۔ کھانسی کا سلسلہ منقطع ہوا! اترے ہوئے چہرے پر مانہ سر نو حیات کا غازہ مل گیا اور اضطرابِ مرض میں سکون کی علامتیں

ظاہر ہو گئیں؛

(۲۳)

سکون ملنے سے مریض نے دونوں آنکھیں بند کر کے قدرے آرام لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھل کر شکر گذاری کے انداز سے میری صورت پر جم گئیں۔ اگرچہ اُس نے زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کیا لیکن اس کے دیکھنے کا طریقہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے دل میں میری طرف سے شکر گذاری کے جذبات پاتا ہے۔ پہلے تو میں ساکت رہا جب اس حالت میں کئی منٹ گزر گئے تو پوچھا۔

"اب تمہارے مزاج کی کیا کیفیت ہے؟"

اس نے جواب دیا

"مزاج؟ آہ! یہ نہ پوچھئے۔ جو سانس آتی ہے وہ غنیمت ہے۔ اب کوئی دم کا ہی مہمان ہوں۔"

"مگر اس وقت تو تمہاری حالت قابل اطمینان نظر آتی ہے۔"

"ممکن ہے آپ کی نظر میں ایسا ہی ہو میں تو اس افاقے کو سنبھالا سمجھتا ہوں جو مرنے سے تھوڑی دیر پہلے ظاہر ہوا کرتا ہے۔"

"تم بہت کمزور رہو۔ بیماریوں نے تمہارے دل و دماغ کو ضعیف کر دیا ہے۔ اگر وہم میں مبتلا ہو گئے تو خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

"یہ وہم نہیں، یقینی امر ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بے انتہائی ناکامیوں کے بعد مجھے

یہ زندگی بھی پسند نہیں۔ اس غدار دنیا سے جتنا جلد کوچ کر جاؤں اچھا ہے۔"

اُس کے اِس جواب کی تہہ میں دلی حزن انگیز جذبات پوشیدہ تھے۔ میرا دل بے چین ہو گیا۔ اس کی غمزدہ حالت پر فکر و غور کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے میری خدمات کا صلہ خوب تجویز کیا! کیا میری تمام کوششیں اسی لئے ہیں کہ وہ خاک میں ملا دی جائیں؟"

"میں آپ کا احسان مند ہوں۔ اگر دوسرے عالم میں اس کا عوض دینا ممکن ہے تو انشاء اللہ ضرور اس دنیا میں اپنی شکرگذاری اور ممنونیت کا اظہار کروں گا۔"

"میں نے کسی قسم کا صلہ حاصل کرنے کی نیت سے خدمت نہیں کی ہے۔ بلکہ محض انسانی فرض ادا کیا ہے۔ البتہ تمہارے حالات معلوم کرنے کا شوق میرے دل کو بے قرار رکھتا ہے۔"

"سچ ہے میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنی ناکامیوں کی داستان کسی کو سنا جاؤں کہ اس سے دوسرے سبق حاصل کر سکیں۔ اور کوئی خدا کا بندہ اپنی فطری دلیری اور دانشمندی کی بدولت اُن مشکلات پر قابو حاصل کر لے جن سے مغلوب ہو کر میں اس انجام کو پہنچا ہوں۔"

(۴)

میرے لئے اس موقع سے بہتر کون سا محل ہو سکتا تھا؟ فوراً اپنے سننے کا اشتیاق موثر الفاظ میں پیش کر دیا۔ ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کر لیا کہ ان واقعات کو افسانے کی صورت میں ملک و قوم کے سامنے پیش کر کے تمہاری یہ آخری تمنا بھی پوری کر دوں گا۔

کہیں پر کمانسی کا دورہ شروع ہو کر واقعات کو ادھورا نہ رہنے دے محض اس خیال سے دوا کی ایک خوراک اور پلا دی۔ اس تدبیر نے بڑا کام کیا مریض تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کی طبیعت بحال تھی اور وہ گزشتہ واقعات عاقلانہ میں تازہ کر کے بیان کرنے پر مستعد ہو چکا تھا میں اپنا اسٹول کھینچ کر بالکل سامنے ہو گیا اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور درد بھری آواز میں کہنے لگا۔

"آپ نے میرے حالات کو مشتہر کر دینے کا وعدہ کر کے میرے دل کا بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ آہ اس بے خبر دنیا کو کیا معلوم کہ روز و شب کے پردے میں کیسے کیسے واقعات نمودار ہوا کرتے ہیں؟ اور ذی علم ہستیاں اپنے اقتدار کے گھمنڈ میں انسانوں کو مجبور کر کے کیوں کر تباہ و برباد کرتی رہتی ہیں؟ میرا تعلق کسی بڑے اور معزز خاندان سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف ایک بہشتی کے گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ بچپنا تو جس طرح ہماری قوم کے بچوں کا گذرتا ہے۔ اسی طرح گذرا گیارہ برس کی عمر میں ایک چھوٹی سی مشک خرید دی گئی اور میں چند گھروں میں پانی بھرنے کی خدمت انجام دینے لگا۔

سب سے پہلے میرا تقرر ایک مولوی صاحب کے گھر میں ہوا۔ اس جگہ میری کم سنی کام آگئی۔ مولوی صاحب کی بیوی میرے سامنے ہونے لگیں اور میں بے روک ٹوک گھر میں آنے جانے لگا۔ اول اول تو اپنا کام کر کے چلا آتا۔ مگر چند روز میں جب ہوا پلٹ گیا تو پانی بھرنے کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر باتوں میں بھی وقت صرف ہونے لگا۔ وہ بڑی بیباک اور خدا ترس خاتون تھیں۔ مجھ پر اپنے بچوں کی

طرح مہربانی کرنے لگیں۔ ان کے پاس محلے کے اکثر بچے آیا کرتے تھے اور وہ انہیں پڑھانے لکھانے کے شغل میں مشغول رہتی تھیں۔ مجھے بھی دیکھ دیکھ کر لکھنے پڑھنے کا شوق چرّایا۔ اگرچہ بہشتی کے لڑکے کو تحصیل علم سے کوئی علاقہ نہ ہونا چاہیئے تھا مگر صحبت کا اثر بغیر رنگ لائے نہ رہا اور میں نے بھی سب لڑکوں کے ساتھ لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔ تجربے نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ مجھے پانی بھرنے کی بہ نسبت لکھنے پڑھنے سے زیادہ مناسبت ہے۔ میری ذہانت کی تعریف سن سن کر مولوی صاحب کو بھی اشتیاق پیدا ہوا اور ایک دن انہوں نے میرا امتحان بھی لیا۔ حُسنِ اتفاق سے میں تمام ہم سبق لڑکوں سے اول رہا۔ شاگرد ذہین ہو تو پڑھانے لکھانے کو معلّم کا دل بھی چاہنے لگتا ہے۔ دو ہی تین روز کے اندر مولوی صاحب نے میرے والد سے مل کر مجھے باقاعدہ تعلیم دینے کی اجازت حاصل کر لی اور اب میں اپنے والدین کی اجازت سے تحصیل علوم میں مشغول ہو گیا :

(۵)

پندرہ برس کے سن میں اس قدر علم حاصل کر لیا جو آئندہ زندگی کے واسطے ضروری تھا۔ خصوصاً اپنی برادری میں تو قابل ترین تسلیم کیا گیا اور ہر صحبت میں تعظیم و تکریم کے ساتھ لیا جانے لگا۔

ساتھ ہی ساتھ کچھ حاسد بھی پیدا ہو گئے جو میری بڑھتی ہوئی قابلیت کو گوارا نہ کر سکے اور انواع و اقسام کی رکاوٹیں پیدا کر کے تحصیل علم کے راستے

میں حائل ہونے لگے۔ شومئی اتفاق سے انہیں دنوں میں دہ بابا بھیلی اور مولوی صاحب ہیضے کا شکار ہو گئے۔ کچھ ان کے انتقال اور کچھ حاسدوں کی ریشہ دوانیوں سے میرا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب مجھے فکر معاش کے ساتھ ساتھ دولت پیدا کرنے کی آرزو دامن گیر ہوئی۔ تعلیم نے میرے خیالات بلند کر دیئے تھے۔ کندھے پر مشک لاد کر گھر گھر پانی پہنچانا اور مہینے پر اپنی گنی تنخواہ وصول کرنا پسند نہ تھا۔ اس واسطے دن رات فکر میں ڈوبا رہتا اور سوچا کرتا کہ "مجھے کیا کرنا چاہیئے۔" آخر یہ طے کیا کہ "شدید محنت کر کے اتنا سرمایہ جمع کر لینا چاہیئے۔ جو کسی چھوٹی موٹی تجارت کے کام آسکے۔" میں نے اس خیال کے ماتحت سخت ترین مشقت سے کام لینا شروع کیا۔ لگے بندھے گھروں کے علاوہ آمدنی بڑھانے کے لیئے جدید گھر تلاش کیئے اور چند مہینوں میں سو روپے جمع کر لیئے۔

اس جمع شدہ رقم کو چمڑے کی تجارت میں لگانا شروع کیا۔ اس تجارت کا آغاز بقر عید سے ہوا۔ مسلمانوں کے ہر گھر میں قربانی ہوتی ہے۔ میں جن جن گھروں میں پانی بھرتا تھا وہاں جا جا کر کھالیں خرید لیں۔ جو سستے داموں ملیں اور انہیں خاطر خواہ منافع پر فروخت کر دیا۔ چونکہ پڑھا لکھا تھا اس خرید اور فروخت کا باقاعدہ حساب رکھنے لگا۔ نفع زیادہ ہونے نے حوصلہ بڑھایا اور اب میں زیادہ توجہ سے اس تجارت سے مصروف ہونے لگا۔ لیکن اپنے آبائی پیشے کو کبھی ترک نہیں کیا۔ جن گھروں میں پانی

دنیا کھاتا برابر دنیا رہا۔ یونہی کئی سال گذر گئے۔ اور اب میری حالت ساری قوم سے بہتر ہو چکی تھی۔ آمدنی معقول تھی اور میرا قصد یہ تھا کہ اس تجارت کو اور وسیع کروں۔

(۶)

بھلا برادری والے اسے ٹھنڈے دل سے گوارا کر سکتے تھے کہ ان کی قوم کا کوئی آدمی ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے تاجر بنے۔ میری تجارت کا فروغ دیکھتے ہی انگاروں پر لوٹنے لگے اور میری تباہی و بربادی کے لئے طرح طرح کی تدبیریں پیدا کرنے لگے۔ ان کا معمول ہو گیا کہ روزانہ میرے والد کے پاس آ کر ان کے کان بھرتے کہ "کلو جوان ہو گیا ہے اور کمانے کھانے لگا ہے۔ اب اس کی شادی کر دینا مناسب ہے۔ خدا نے تمہیں سب کچھ دیا ہے۔ آخر برادری کا بھی کچھ حق ہے؟ اسے کب کھلاؤ گے؟ آج گھر گھر یہی چرچا ہے کہ تم نے کبھی بھائیوں کے ہاتھ نہیں دھلائے۔ پہلے تو ناداری کا عذر تھا۔ مگر اب تو سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ کلو اکیلا بیچ بیچ کر سینکڑوں روپے پیدا کرتا ہے۔"

الغرض ایسا روغن قاز ملا کہ والد ان کے تانے میں آ گئے اور ایک دن مجھ سے ذکر چھیڑا۔ میں نے ہر چند عذر کیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی بلکہ غصہ سے جھنجھلا کر جواب دیا کہ "اگر تم میرا کہنا نہ مانو گے تو میں کنویں میں گر کر اپنی جان دے دوں گا۔ جوان جہان ہو گئے ہو مگر شادی بیاہ کے نام سے نفرت ہے۔ ساری برادری کا کھا لیتے ہیں مگر کھلانا ایک دفعہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔"

مرد تو خیر! سمجھانے بجھانے سے مان بھی لیتے ہیں لیکن عورتیں جب کسی بات کے پیچھے پڑ جاتی ہیں تو بغیر اسے پورا ہوئے نہیں مانتیں۔ اس تحریک کی بھنک میری والدہ کے کان میں جو پڑی تو جھاڑ کا کانٹا بن کر میرے چپٹ گئیں اور میرے دلائل اپسنتا ایسا، زبان ہلانے کی بھی اجازت نہ دی۔ عاقبت کار مجھے ان کی ضد کے سامنے ہزیمت قبول کرنا پڑی۔

(۷)

ہرا نرمی والے اپنی کامیابی پر بغلیں بجا رہے تھے اور میں اس ابلہانہ شادی پر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا مگر میرے رنج و غم کا اثر کچھ نہ ہوا۔ کماؤ آدمی کو لڑکی ملنے دیر نہیں لگتی۔ دکھنی جگہ سے بات آگئی۔ والد اور والدہ نے ایک لڑکی کو منتخب کر کے منگنی کر دی۔

آہ! جب ان فضول رسموں کا دھیان کرتا ہوں، جن میں میری گاڑھی محنت کی کمائی بے دردی سے لٹائی جا رہی تھی تو کلیجہ خون ہو جاتا ہے۔ قرابت دار عورتیں اپنے بچوں پوتوں سمیت شادی سے بہت پہلے بلائے ناگہانی کی طرح آدھمکیں۔ صبح سے آدھی رات تک ڈھولک پیٹ پیٹ کر اور بے سری ہانکیں لگا لگا کر محلے والوں کے اطمینان و سکون کو غارت کرنے میں انہیں ذرا بھی تکلف نہ ہوا۔ مختصر یہ ہے کہ ایک ایک کر کے تمام رسمیں کمال اولوالعزمی سے ادا ہوئیں اگرچہ میری کئی سال کی کمائی کے علاوہ کئی سو کی رقم قرض لے کر بھی صرف کر دی۔ مگر خدا

کا ہزار ہزار شکر ہے کہ برادری میں ناک رہ گئی خصوصاً اس وقت والد کی خوشی کا اندازہ مشکل تھا جب پنچوں نے بالاتفاق تسلیم کر لیا کہ "جیسا کام کلوا کا ہوا ہے ابھی تک برادری میں اور کسی کا نہیں ہوا۔"

بیجیے، شادی ہو گئی لیکن مہاجن کا قرض جس کی مقدار پورے سات سو تھی ـــــ واجب الادا رہ گئی۔ چودہ روپے مہینہ سود کا دینا، پھر گھر کا خرچ چلانا۔ ایک سر ہزار سودے کا مصداق تھا۔ لیکن اٹھتی ہوئی جوانی کے دنوں نے حوصلہ بڑھائے رکھا اور میں پہلے سے زیادہ محنت و مشقت سے کام لینے لگا کہ نہ کسی طرح کھانوں کی تجارت جاری رکھی اور آہستہ آہستہ قرض کی ادائی میں مصروف رہا۔

(۹)

نہ پوچھیے کہ سات سو کی رقم اور اس کا سود ادا کرنے میں کتنی عرق ریزی اور جاں فشانی کرنا پڑی ہے۔ کہ پسینہ بہہ بہہ کر پاؤں تک آ جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے پانچ سال کی محنت و جفاکشی کے بعد مہاجن کے قرضہ و غلامی سے رہائی نصیب ہوئی اور میں اطمینان کی سانس لینے کے قابل ہو سکا۔ اب کی وثوق کے ساتھ یقین تھا کہ اگر درمیان میں کوئی نئی افتاد نہ پڑی تو چند برسوں کی سعی و کوشش کے بعد میں بھی شہر کے چھوٹے موٹے تاجروں میں شمار ہونے کے قابل ہو سکوں گا۔

دو تین برس کے الٹ پھیر میں تھوڑی بہت رقم جمع بھی ہو گئی۔ اندازہ ہو گیا ساب کی میں نے گھر میں رکھنے کے بدلے سیونگ بنک میں جمع کر دی تھی کیونکہ گھر میں رکھنے سے

خوف تھا کہ ماں باپ یا بیوی کو خبر لگ گئی، تو پھر کوئی فریضہ پیدا کر کے رقم صرف کرنے کی زبردست کوشش کی جائے گی اور مجھے مجبوراً اپنے بڑھے ہوئے حوصلوں کا خون کرنا پڑے گا۔

آہ! میری حفاظتی کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ برادری کا دباؤ اور والدین کی ناعاقبت اندیشی کے آگے ایک نہ چلی۔ اس کا حال یہ ہے کہ اس عرصہ میں میرے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا اور اب اس کی عمر تقریباً پانچ سال کی ہو چکی تھی۔ والدین کو اس کے مونڈن کی فکر تھی۔ میری غیر حاضری میں صلاح و مشورہ ہوا کرتا تھا لیکن مجھ سے کہنے کی جرأت کسی کو نہ ہوتی تھی۔ برادری والے بھی میری مالی حالت سے خبردار تھے اور چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی تدبیر سے پھر مجھے مفلس قلاش بنا دیں۔ چنانچہ ایک روز سب نے اتفاق کر کے مجھے گھیرا اور بچے کے مونڈن کا تقاضہ شروع کیا۔ میں نے ہر چند حیلہ حوالہ کیا لیکن ایک سماعت نہ ہوئی۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ تا مقدور ان لٹیروں کا مقابلہ کروں گا لیکن ان ظالموں نے اپنے اُسی بے پناہ حملے سے کام لیا جس کے سامنے رسوم و قیود کے بندے تابِ دم زدن نہیں رکھتے یعنی میرا اور میرے والدین کا حقہ پانی بند کر دیا۔ مجھے تو اس کی پرواہ نہ ہوئی لیکن والدہ کہتی ہیں کہ گھر جان دینے پر آمادہ ہو گئیں اور والد دریا میں ڈوبنے چلے۔ میں نے ہر چند روکنا چاہا مگر وہ راضی نہ ہوئے ناچار مجھے ہار ماننا پڑی۔

(۹)

اس دفعہ بھی پہلے ہی کی طرح مقروض ہونا پڑا۔ محنت کے رائیگاں ہونے کا جو دکھ ہُوا اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ اس صدمہ کا ایک اثر یہ ہُوا کہ جسمانی طاقت نے جواب دے دیا۔ کمزور کو ہر آزار دبا لیتا ہے۔ افکار کی فراوانی نے حرارت پیدا کر دی آنکھیں جلنے اور دل بیٹھنے لگا۔ محنت و مشقت شاق ہو گئی تاہم ہمت ہاتھ تھامے رہی اور میں نے اپنا کام بدستور جاری رکھا۔ دن گذرتے گئے لیکن اب کی مہاجن کا قرض اُس طرح ادا نہ کر سکا جیسے پہلے ادا کیا تھا کیونکہ بیماریوں نے گھر دیکھ لیا تھا آئے دن حکیم ڈاکٹر کی دربار داری کرنا پڑتی تھی۔

موہن کے پورے ایک سال بعد پہلے والد اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد والدہ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ نہ کرنے پر بھی کئی سو روپے خرچ ہوئے۔ مہاجن کے قرضے کا سود کھائے جاتا تھا اور مشکل یہ تھی کہ زیادہ محنت کرنے سے بخار تیز ہو جاتا تھا۔ اس لئے کام میں پوری توجہ صرف کرنے سے قاصر تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ تجارت کے کاموں میں کمی پیدا ہو گئی۔ آمدنی کم خرچ زیادہ ہونے کی حالت میں جو کیفیت ہوتی ہے۔ غالباً آپ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ فکر اور کوفت نے گھلانا شروع کیا۔ حرارت پرانی ہو کر دق کے آثار رونما ہوئے۔ علاج معالجے میں کمی نہ کی مگر روحانی آلام پر فتح حاصل کرنا ممکن نہ ہُوا۔ دق کے ساتھ دمہ بھی شروع ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ کھٹیا سے لگ گیا۔

(۱۰)

مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی ہے —— آتی ہے اور آندھی کی طرح! پھر یہی نہیں کہ ایک حد پر قائم ہو جائے بلکہ لیل و نہار کے ساتھ افزوں سے افزوں تر ہوتی رہتی ہے۔ یہی حال میرا بھی ہوا۔ سوئے اتفاق سے شہر میں پھر وبا پھیلی اور میری اہلیہ اس میں مبتلا ہو کر راہیٔ عدم ہوئی۔

اب میری گرہ میں کیا تھا جو اس کا کام کرتا؟ جو لوگ ان موقعوں کو انعام الٰہی سمجھ کر اور بظاہر ہمدردی بن کر آموجود ہوتے ہیں وہ اصول کے موافق تشریف لائے۔ مگر ع

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

ناداری کے راز سے خبردار ہو کر رخصت ہو گئے۔ خورد سال بچے کو اس کی ننھیال والے لے گئے۔ میں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جانتا تھا کہ میں بھی جلد از جلد وہیں جانے والا ہوں جہاں میرے نا سمجھ والدین اور جھوٹی نمائش پر شاد ہونے والی بیوی گئی ہے۔ مگر ابھی ایک داغ اور اٹھانا باقی تھا۔ شاید پندرہ بیس دن اس واقعہ کو گزرے تھے کہ بچہ بھی اسی موذی مرض میں مبتلا ہو کر اپنی ماں سے جا ملا؛

(۱۱)

مہاجنوں کو جب میری حالت کی اطلاع ہوئی اور انہوں نے سمجھا کہ رقم ڈوب رہی ہے تو صلہ رحم اور مروت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے مطلب کا دعوے کر دیا۔ میں علیل، کوئی پیروکار نہیں۔ برادری والوں سے امداد چاہی، مگر ادھر سے صاف جواب مل گیا۔ جن لوگوں نے کھاتے وقت محبت اور اخوت کے لمبے چوڑے

دعوتیں پیش کیے تھے آج بالکل نا آشنا بن گئے! مختصر یہ ہے کہ اس آڑے وقت میں کسی اللہ کے بندے نے ساتھ نہ دیا۔ بلکہ الٹے میری مخالفت پر آمادہ ہو کر میرے خلاف گواہیاں دیں اور ڈگری ملنے پر مہاجن کو قرقیاں اجرا کرنے کا مشورہ پیش کیا۔ کچھ عقل کے پُتلوں نے مجھے مُسرف، بے وقوف اور آوارہ مشہور کیا اور مجھ پر یہ مثل صادق آئی کہ جن کے کارن سر منڈایا وہ کہیں سر منڈے۔

مختصر یہ کہ گھر بار، مال، اسباب اور رہا یہ بساط مہاجنوں کے کٹے لگی۔ اس حادثے کے بعد میرا آزار بہت جلد جلد درمیانی منازل طے کرتا ہوا انتہائی منزل تک پہنچ گیا۔ خدا کے سوا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ ایک غریب دلال نے جس سے چمڑے کی تجارت کے سلسلے میں یاد اللہ ہو گئی تھی۔ اس تنگ وقت میں ساتھ دیا وہ گاہ بگاہ دو چار روپیوں سے بھی سلوک کرتا رہتا۔ ایک روز میں نے اس سے خواہش کی کہ مجھے اسپتال پہنچا دیا جائے۔ میری التجا پر وہ اپنے ساتھ مجھے یہاں لے آیا۔

یہ ہے میری سرگذشت جو بیان ہوئی۔ اگرچہ ہندی رسم پر موت مسلط کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اہل برادری اور ان کے تباہ کن رسوم نے ہلاک کر دیا۔ کاش! کوئی ایسا جری پیدا ہو جائے۔ جو ان خون چوس کر ہلاکت کے گڑھے میں ڈھکیلنے والی جونکوں کو فنا کر کے دنیا اور دنیا کے بسنے والوں کو ان کے شر سے محفوظ کر دے۔

میری آرزو یہ ہے کہ آپ ان واقعات کو حسب وعدہ افسانے کی صورت میں شائع کر کے ان نوجوانوں کو خبردار کر دیں۔ جو میری طرح ترقی کی دھن میں لگے ہیں۔

مگر رسوم و قیود کی وجہ سے کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے ؛

(۱۲)

مجھے ان واقعات کے سننے سے بے حد تکلیف ہوئی میں بعض کے ساتھ پہلے سے زیادہ ہمدردی کرنے پر آمادہ ہو گیا لیکن اس کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ شمع حیات جھلملا رہی تھی۔ صرف ایک ہلکے سے ہوا کے جھونکے کی کسر تھی۔ انجام وہی ہوا جو پہلے مقدر ہو چکا تھا۔ مذکورہ بالا واقعہ کے ایک ہفتے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ اس کا کوئی وارث موجود نہ تھا۔ اور برادری والے غیر متعلق ہو گئے اس لئے سرکاری طور پر تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ اس وقت میں مجھ سے جو کچھ ممکن تھا اس سے دریغ نہ کی اور مسے تا مقدور اچھی طرح غسل و کفن دے کر دفن کر دیا اور اس کے بیان کئے ہوئے واقعات کو بالکل سادہ طور پر لکھ کر پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس کی روح میری اس ناچیز خدمت کو قبول کرے گی ؛

وکیل کی بیوی

(۱)

مریمؔ نے اپنی سسرال میں داخل ہوکر اسی شرم وحیا کا مظاہرہ کیا جو ایشیائی اور بالخصوص ہندوستانی خواتین کا طغرائے امتیاز ہے۔ اگرچہ اس موقعہ پر نئی دلہنیں پہلیں گھونگھٹ الٹ کر بے تکلف نہیں ہوتیں لیکن اُن کے برخلاف مریمؔ کو چوتھی چالے کی رسمیں ختم ہوتے ہی گھر کا کام دھندا سنبھالنا پڑا۔

گھر میں بوڑھی ساس اور ادھیڑ چچیا خُسر کے سوا کوئی نہ تھا۔ حقیقی خسر تو اکلوتے بچے کا سہرا دیکھنے کا ارمان دل میں لئے ہوئے کبھی قبر میں جا سویا جب سلیمانؔ تعلیم کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اُن کے بعد سے یتیم لڑکے کی پرورش اور تربیت کا بار چھوٹے چچا نے اٹھایا۔

اس میں شک نہیں کہ غضنفر نے سلیمان کی خبرگیری میں مقدور بھر کوتاہی نہیں کی اور ایسے انتظامات کیئے کہ وہ شریف زادوں کی طرح تعلیم اور تربیت حاصل کر سکے لیکن متوسط الحال خاندانوں میں کھانے کمانے کا سوال بہت ٹیڑھا ہوتا ہے خصوصاً اُس مقام پر جہاں اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنے کی عادت بیش از بیش ہوتی ہے۔

ہم تسلیم ہے کہ مظفر نے اپنے بعد اتنی جائداد ضرور چھوڑی تھی کہ غضنفر چاہتا تو سفید پوشوں کی طرح اُس جائداد کی آمدنی سے بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجے کے ساتھ اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کر سکتا تھا اور بھتیجے کی نگرانی کا معقول عذر بھی موجود تھا جس سے نکتہ چینیوں کی زبان بند کی جا سکتی تھی لیکن اس کی ذاتی غیرت اور نسلی شرافت نے پسند نہ کیا کہ یتیم بھتیجے کی میراث پر ہاتھ صاف کرے۔

یہ اسباب تھے جن کی بنا پر غضنفر، سلیمان کی اتنی نگرانی کرنے سے معذور رہا۔ جو مرحوم بھائی کی ناوقت وفات نے اس کے ذمہ عائد کر دی تھی۔ وہ مضافات کے کسی زمیندار کے یہاں ملازم تھا اور ملازمت کے سلسلے میں اکثر وطن سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ سال میں دو تین دفعہ بھی مشکل ہی سے وطن آتے اور بھاوج بھتیجے کی دیکھ بھال کا موقعہ نکال سکتا تھا۔

اپنی ان مجبوریوں پر نگاہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ایک دوست کو اپنی قائمقامی کے واسطے منتخب کیا تھا اور حقیقت میں یہ انتخاب لاجواب تھا کیونکہ میر باقر نے

اپنی مفروضہ خدمتوں کو پوری دیانت داری اور مستعدی سے انجام دیا۔ جائداد کی آمدنی میں ایک پیسے کا بھی تغلب و تصرف نہیں کیا اور رسمی سے بھی کم استعداد والا شخص تعلیمی ضروریات پر ضمنی توجہ صرف کر سکتا ہے۔ اس میں ذرا بھی قصور نہ کیا۔ یہاں تک کہ سلیمان نے کسی نہ کسی طرح یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی؛

(۲)

عورتوں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جتنا بھی جلد ممکن ہو سکے لڑکے کو دولہا بنا کر دلہن بیاہ لائیں۔ گھر آباد ہو اور نسل میں ترقی شروع ہو جائے۔ اس ارمان کے راستے میں انہیں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں وہ ان کی مطلق پرواہ نہیں کرتیں۔ اس موقعہ پر ان کی فطری جذرسی غائب ہو کر دریادلی اور اولوالعزمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور انجام بینی تو ایسی گم ہوتی ہے گویا اس کا وجود ہی نہ تھا! حالانکہ بسا اوقات اُن کی جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی کے بد نتائج فوراً ہی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کی زندگی یکسر رنج و مصیبت بن کر رہ جاتی ہے۔

بہرحال کچھ بھی ہو لیکن ہندوستانی ماں اپنے دل سے یہ جذبہ دور نہیں کر سکتی۔ اولاد والی ہونے کے بعد وہ صرف اپنے جگر پاروں کے لئے جیتی ہے اور بالآخر انہیں کے واسطے مرجاتی ہے سلیمان کی ماں بھی ان جذبات سے خالی نہ تھی۔ دست قضا و قدر نے بھری جوانی میں اُس کی مانگ اجاڑ دی تھی۔ اُس نے زندگی کے سخت دن اور پہاڑ سی راتیں محض سلیمان کے سہارے پر صبر و تحمل سے

بسر کر دیں۔ جب خدا کی ساری مخلوق بستر راحت پر آرام کی میٹھی نیند سوتی تھی، اور اُن کے خراٹوں کی آواز کے سوا کوئی چیز خاموش فضا کو مرتعش کرنے والی نہ ہوتی تھی تو یہ دکھیا عورت گھڑی گھڑی اپنے لاڈلے بچے کی صورت دیکھ کر دلی تخیل سے تسکین حاصل کرتی تھی۔ ہر چند مستقبل کے بارے میں صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا مگر نہ معلوم محبت کا تقاضا تھا یا حسنِ ظن لیکن اسے سلیمان کی ذات سے بہتری کی امیدیں تھیں۔ درحقیقت انہیں امیدوں نے اُس کے ناتواں دل میں سوز بیوگی برداشت کرنے کی قوت پیدا کر دی اور اس نے سکون و استقلال کے ساتھ اتنا لمبا چوڑا زمانہ بسر کر دیا۔

اب ـــــ جبکہ سلیمان کھیل کود کے دن گزار کے سنِ رشد میں قدم رکھ چکا۔ نہ اس کی دیرینہ آرزوئیں جو کسی سرپرست اور خبر گیر کی غیر موجودگی سے مضمحل ہو کر ایک خاص وقت تک کے لیے سو گئی تھیں موقعہ دیکھ کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ بیدار ہو گئیں۔ تکمیل مراد کی کوششوں کو نظرانداز کر دینا تو قریب قریب تمام عورتوں کی فطرت سے بعید ہے۔ خاص کر سلیمان کی ماں اس معاملے میں اپنی ہم جنس سے بہت بڑھی چڑھی ہوئی تھی۔ جن دنوں سلیمان میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ جب ہی اس نے مریم کی ماں سے پیام سلام شروع کر دیا تھا۔ مگر غضنفر نے تعلیمی سلسلہ قطع ہو جانے کے خوف سے اب تک باز رکھا تھا۔ اب بی۔ اے کی ڈگری ملتے ہی اسے اپنی آرزوؤں کا دبا ہوا شرارہ ہو گیا۔ پہلے تو اس نے مریم کی ماں سے مل کے چپکے چپکے سب

امور طے کیے اور جب بات پکی ہوگئی تو دیور کو طلبی کا پیام بھیجا۔

(۲۷)

غضنفر کو جب بھاوج کا پیام طلب وصول ہوا تو وہ کاموں میں اس درجہ منہمک تھا کہ دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ مگر اسے مرحوم بھائی کی وصیت یاد تھی۔ اس کے کانوں میں ہنوز یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ "بھیّا! ایک بیوہ عورت، ایک یتیم بچہ اول خدا بعدہ تمہاری حفظ و امان میں ہے۔ اس کی تمام برائیوں بھلائیوں کے لئے خدا کے سامنے صرف ——— اور صرف تم ہی جوابدہ ہو۔ اگر میرا کوئی حق تمہارے ذمے ہے اور تم نے اسے فراموش نہیں کیا ہے، تو میری یہ پہلی اور آخری وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنا کہ میرے بعد میری بیوی اور بچے کو تکلیف نہ ہونے پائے۔ خدا کی عنایت سے اتنا کافی ذخیرہ چھوڑے جاتا ہوں کہ تم پر ان کی معیشت کا بار نہ پڑے گا۔ میری چھوڑی ہوئی جائداد کی آمدنی خانگی اخراجات کو کافی ہوگی۔ البتہ حفاظت اور نگرانی کی خدمت تمہارے ذمہ ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ منصبی خدمتوں کے ہوتے ہوئے تمہیں خانگی انتظاموں کے لئے مشکل سے وقت ملے گا۔ پھر بھی مواقع مجبور کرتے ہیں کہ میں یہ کام تمہارے ہی سپرد کردوں۔ جہاں تک غور کرتا ہوں، خدا کی اس وسیع آبادی میں تمہارے سوا کوئی ایسا نہیں دکھائی دیتا، جو خدا کے بعد اس بیوہ عورت اور یتیم بچے سے سچی ہمدردی ظاہر کرے۔ بولو ——— تمہیں کیا منظور ہے؟ کیا اس بھائی کی جس نے ہمیشہ مہربان باپ کی طرح شفقت کی ہے ایک خواہش ——— ایک آرزو پوری کرنے کی زحمت گوارا کروگے

اُس کی بیوہ اور اُس کے یتیم کی سرپرستی کا بار اٹھاؤ گے؟"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ہر وقت غضنفر کے کانوں میں گونجا کرتے تھے اور وہ حاضر و غائب بھاوج اور بھتیجے کی فلاح و بہبود کے اسباب پر غور کیا کرتا تھا۔ اس کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ جب تک سلیمان وکالت پاس کر کے کسی کام پر نہ لگ جائے ازدواجی زندگی سے علیحدہ ہی رہے لیکن عورتوں کی فطرت بھی فراموش ہونے والی چیز نہ تھی۔ اگرچہ اُس کا گھر اولاد کی نعمت سے محروم تھا اور اُسے ان تمناؤں اور امنگوں کا ذاتی تجربہ نہ تھا جن سے اولاد والوں کے دل واقف ہوتے ہیں پھر بھی ان لوگوں کی طرح جو آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن کر علم حاصل کرتے ہیں اس نے بھاوج کے قلبی ارمانوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ انہیں ارمانوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے جتنا جلد ممکن تھا ضروری کاموں سے فراغت حاصل کی اور ایک مہینے کی رخصت لے کے وطن چلا آیا۔

غضنفر کو گمان تھا کہ شادی کے تمام انتظامات کرنا ہوں گے۔ ان وقتوں میں خاص طور پر جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ سب بازار سے خریدنا اور بنوانا پڑیں گی لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ سلیمان کی والدہ نے ابتدا ہی سے چپکے چپکے سامان جمع کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کی سلیقہ مندی نے شادی کے تمام لوازمات کافی سے بھی زیادہ فراہم کر لئے ہیں۔ تو بے اختیار اس کی انتظامیہ قوت کی داد دینا پڑی۔

شادی کے ابتدائی مرحلے تو پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ اب صرف عقد کی تاریخ مقرر ہونا باقی تھی، وہ بھی باہمی مشورت کے بعد مقرر کر دی گئی اور سلیمان کی پہلوتہی کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ ایک مبارک رات کو احباب اور عزیزوں کے سامنے خطبۂ نکاح کے پاک رشتے میں ایسی دو ہستیوں کو جکڑ دیا گیا جنہیں ازدواجی زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

(۴)

سلیمان کی نیک نفسی اور پاکبازی میں تو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن مروجہ تعلیم نے اس کے مزاج میں آزادی کی روح پیدا کر دی تھی۔ اُسے جدید کھیلوں کا بھی شوق تھا۔ روزانہ شام کے وقت کرکٹ کے وکٹوریہ پارک میں ٹینس کھیلنے جانا اسی طرح فرض تھا جیسے پانچ وقت کی نماز۔ کئی کلبوں کا ممبر بھی تھا۔ اس کی خوش طبعی اور بذلہ سنجی نے سینکڑوں دوست پیدا کر دیئے تھے جو ہر وقت اسے گھیرے رہتے تھے۔ کھیل کے ٹائم اور کلب کے اوقات کے علاوہ بھی بے تکلف دوستوں کی صحبت میں اس کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا تھا۔

وہ مبدا فیاض سے ذوقِ سلیم لے کر آیا تھا اور کالج چھوڑنے سے پہلے ہی شرابِ سخن کا عادی ہو چکا تھا۔ اسے شاعری سے فطری مناسبت تھی اور معمولی فکر میں پاکیزہ مضامین کے ڈھیر لگا دیتا تھا۔ اس کے اشعار زبان کے لحاظ سے نہایت فصیح اور روزمرہ کی جان ہوتے تھے اور جب معنویت پر غور کیا جاتا تو رفعتِ تخیل اور نوعیتِ مضامین کے ایسے ایسے نادر نمونے دکھائی دیتے کہ اساتذہ وقت عش عش کرنے لگتے۔ بارہا

ایسا ہوا ہے کہ کالج کے مشاعروں میں اس کی غزلوں نے کامیابی حاصل کر کے میڈل حاصل کئے ہیں اور متعدد بار دیکھنے میں آیا ہے کہ اردو کے بیشتر مجلّوں نے اس کے مضامین نقل کر کے ستائشی نوٹوں کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ باوجود فن کی مہارت کے اس نے نہ تو غزلوں کا دیوان ترتیب دینے کا خیال کیا اور نہ نثر کے مضمونوں کا مجموعہ بنانے پر مائل ہوا۔ احباب نے جب کبھی ان امور پر توجہ دلانے کی سعی کی۔ تو اس نے ٹال مٹول کر دی۔

وہ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ آدھی رات تک غائب رہتا تھا۔ اور یہ وقت اکثر مہ جبین کی مزیدار صحبت میں گزرتا تھا۔ جہاں نہ تو رقابت کا خدشہ تھا نہ مالی نقصان کا احتمال۔ مہ جبین طائف تھی اور اس کی دلچسپ باتوں کی شیفتہ وجد آفریں کلام کی شائق۔ اگر کسی دن سلیمان اس کی صحبت سے غیر حاضر رہتا۔ تو مہ جبین کے حریم ناز میں اندھیرا سا چھایا رہتا۔ حاضرین بزم کی طبیعت بے کیف رہتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ادھر نو بجے سلیمان نے کھانے سے فراغت کر کے ہاتھ دھوئے اور دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ باہر نکل کے دیکھا تو کوئی نہ کوئی دوست مہ جبین کے یہاں لے چلنے کے لئے موجود ہے۔ مختصر یہ ہے کہ کوئی منحوس ہی رات ایسی ہوتی ہو گی جو سلیمان مہ جبین کی بزم ناز میں نہ جاتا ہو۔

روزانہ صحبت اور بے تکلفی کی بدولت سلیمان کے دل کو مہ جبین سے مؤانست سی ہو گئی تھی۔ جب وہ مہ جبین سے دور ہوتا تھا تو مغموم سا رہتا تھا۔ اس صورت

میں شگفتگی اور بشاشی قریب نہ پھٹکنی تھی۔ اس کی بھولی بھالی پرکار اور میٹھی میٹھی باتوں سے دل کو حلاوت محسوس ہوتی تھی اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا وہ اپنا وقت مہجبین کی حسین صحبت میں بسر کرتا تھا۔ اسے قانون کے خشک مضامین سے دحشت سی ہونے لگی تھی۔ وہ امکان بھر پڑھنے سے جی چراتا تھا۔ گھر میں بھی خاص خاص وقتوں کے علاوہ بہت کم ٹکتا تھا اور انہیں وجہوں کے ماتحت اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیئے شادی سے بچنے کی کوشش کی تھی۔

شادی ہونے کے بعد بھی اُس کے ان معمولات میں بہت ہی کم فرق پڑا۔ وہ بھی اس لیئے کہ وہ کسی شریف خاتون کی دلشکنی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح آزاد اور اپنے وقت کا مختار نہیں ہے۔ آسے ایک ایسی ہستی کے لیئے ایثار کی ضرورت ہے جو اُس کے پلّے باندھ دی گئی ہے۔ دل کا شوق مہجبین کی طرف کھینچتا تھا اور مروّت بیوی کی خاطر پر مجبور کرتی تھی اور اس کشاکش میں اس کی تفریح کا تھوڑا وقت ضائع ہو جاتا تھا۔

(۵)

مریم نے دو مہینے تک سلیمان کا رویہ دیکھا نئی دلہن تھی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکی، دل ہی دل میں کڑھ کڑھ کے رہ گئی۔ آخر کب تک اس کج روی کا مقابلہ کرتی؟ آہستہ آہستہ صبر و شکیبائی کی طاقت جواب دینے لگی۔ اپنے مجازی خدا کے بگڑے ہوئے تیوروں کو بنانا اور پیشانی کے بل نکالنا اُس کا پہلا فرض تھا۔ ماں باپ

جس کو ہاتھ پکڑا دیں۔ اس کے دل میں حسنِ اطاعت کا سکّہ رائج کرنا کتخدا لڑکیوں کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے اور سچ یہ ہے کہ مریم اس حقیقت سے انجان بھی نہ تھی۔ اس نے راتوں کو جاگ جاگ کے میاں کی کشیدگی کا راز دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ذہانت اور ذکاوت میں تو کمی نہ تھی لیکن مخفی رازوں کی لاعلمی کا کوئی علاج نہیں ہے۔

خانہ داری کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی اس نے جس عدیم النظیر سلیقہ مندی کا اظہار کیا۔ فی الواقعہ وہ اس کی ہم عمر لڑکیوں سے شاید ہی ظاہر ہوا ہو۔ اس نے تمام ان بدنظمیوں کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا جنہیں اس کی خوشدامن ضعیفی اور ناطاقتی کی وجہ سے دور نہ کر سکتی تھی۔ سارا گھر چندن کی طرح صاف اور دلہن کی طرح آراستہ کر دیا۔ جس چیز کے لئے جو جگہ موزون تھی وہیں اس کا ٹھکانا بنا دیا۔ علی الخصوص سلیمان کا کوئی کام ایسا نہ تھا جو کسی ترتیب یا سلیقے کے ماتحت نہ ہو۔ سلیمان کو بھی اپنی بڑھی ہوئی راحتوں کا احساس تھا۔ پہلے اسے باہر جاتے وقت ایک ایک چیز تلاش کرنا پڑتی تھی مگر اب ہر شئے آسانی سے مل جاتی ہے اور شاید ہی کوئی ایسا کام ہو جس کے واسطے حکم دینے کی ضرورت پڑتی ہو۔ مریم کی اطاعت کوشی حکم سے پہلے ہر خدمت انجام دے دیتی ہے۔

یہی خوبیاں تھیں جو اپنی مخفی کشش سے سلیمان کا دل کھینچ رہی تھیں۔ اور وہ گلے شکوے کے بغیر بھی دل ہی دل میں اپنے افعال پر نادم تھا۔ اس کی

تجلتیں مُضر تھیں کہ آوارہ گردی کی زندگی سے تائب ہو کر ایک ایسی دیوی کا پرستار بن جائے جو اپنی خالص خدمت گذاریوں سے دنیا ہی کو اس کے واسطے جنت الفردوس بنا دے۔ اس نے ان نیک عزائم کو عملی تشکیل دینے کی سعی بھی کی۔ وہ دو دن گھر ہی سے نہ نکلا اور نکلا بھی تو ان احباب سے بچتا ہوا جن کی نسبت اس کے حسنِ ظن نے شرافت کا فریب دیا تھا جو اس کو اپنی رہبری میں بہکا کر گمراہ کر رہے تھے لیکن وہ مجبور تھا کہ اس کی بذلہ سنجیوں نے قلوب کو بے طرح مائل کر لیا تھا اور تمام یارانِ ہمرنگ اُس کی جستجو میں لگے رہتے تھے۔ ادھر اس نے چوکھٹ سے قدم نکالا کہ کوئی نہ کوئی بے تکلف دوست مل گیا۔ ملا اور نہ جانے کا پیام طلب بن کر ملاقات کی دعوت پیش کر دی، پھر معقول عذرات بھی نامسموع ٹھہرے۔ اس کی ذات میں اخلاقی جرأت اتنی نہ تھی کہ احباب کے اصرار کا ترکی بترکی جواب دے سکتا۔ عاقبت کار ہزیمت قبول کرنا پڑتی۔ پھر وہی قربان گاہِ اخلاق تھی اور گناہوں کی دیوی پھر وہی معصیت کاروں کا مجمع تھا اور جذبات شباب میں نفسانی ہیجان پیدا کر دینے والی زمزمہ سرائیاں۔ ہر چند نتیجے کے لحاظ سے یہ صحبتیں کتنی ہی بد کیوں نہ ہوں مگر جاذبِ توجہ تو اتنی ہوتی ہیں کہ خود اس کے ساتھ خدا بھی فراموش ہو جاتا ہے اگر سلیمان اپنے وہ عزائم جن کے ساتھ پورے استقلال سے مقابلہ کرنے پر آمادگی نہ ہوئی ہو محو کر دے تو چنداں عجب نہ کرنا چاہیئے۔

مریم کی خوشدامن ایک تو فطری نیکیوں کی بدولت یوں ہی مریم پر فدا تھی۔ اُس

پر اُس کی سلیقہ شعاری ”بے زبانی اور مظلومی“ نے تو شمع پر پروانہ ہی بنا دیا۔ وہ مقدور بھر بہو کی دلجوئی کرتی اور تا امکان کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتی۔ اُسے عام اجازت تھی کہ جو چاہے پکائے کھائے اور جو چاہے بنائے پہنے جو ان لڑکیوں کو زیورات سے عشق ہوتا ہے۔ اُن کی شکایات دور کرنے میں نئے نئے گہنے اکسیر ثابت ہوتے ہیں۔ مریم کی ساس عورت ہونے کی حیثیت سے یہ راز سمجھے ہوئے تھی۔ چنانچہ اُس نے اس تدبیر پر بھی پورا پورا عمل کیا۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ مریم اس معمولی سطح سے بہت بلند ہے۔ وہ سنہری جال میں پھنسنے والا طائر نہیں۔ سونا۔ چاندی یا ہیرا موتی اس کے دل میں وہ کیفیت پیدا نہیں کر سکتے جو سلیمان کی ملتفت ہوئی ایک نگاہِ التفات میں پنہاں ہے۔

وہ دیکھا کرتی تھی کہ جب مریم کے ہاتھ میں کوئی کام نہیں رہتا تو چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچا کرتی ہے یا راتوں کو گھنٹوں سلیمان کے انتظار میں در کی طرف تاکا کرتی ہے تو اس کا کلیجہ کرب کی شدت سے پھٹنے لگتا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا گویا اس مظلمہ کی ذمہ دار میں ہی ہوں۔ میں نے ہی اپنے دل کا ارمان نکالنے کے لئے ایک بے زبان لڑکی کی زندگی برباد کی ہے۔ یہ میری ہی جہالت کا حسرتناک انجام ہے کہ مریم اپنی جوانی کا سکھ بھوگنے سے محروم رہی جاتی ہے۔ اس غلطی کی تلافی میں اس نے چند مرتبہ سلیمان کو سیدھی اور نیک راہ اختیار کرنے کی فہمائش بھی کی اور محلہ کی لڑکیوں کو وہ گھڑی منس بول کر مریم کا بھی بہلانے کی دعوت بھی دیدی۔

خیال کے مطابق یہ تدبیر ایک حد تک مفید بھی ثابت ہوئی۔ جوان جہان لڑکیوں کی صحبت نے بظاہر مریم کے دل سے تنہائی کا غم دور کر دیا اور وہ ان سے بہت جلد گھل مل گئی۔ چند روز میں اُس کی طبعی ذہانت نے اپنے ستر باج کو راہ راست پہ لانے کی تدبیر سے پیدا کر لی اور اُسے ایک اجمالی کی زبانی ان سازشوں کی اطلاع ہو گئی جن کی وجہ سے سلیمان اس کی جانب میلانِ طبع ظاہر کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے بطور خود غور کرنا شروع کیا کہ اس موقعہ پر کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟ اگر وہ نسوانی فطرت کے مطابق کاشانۂ امن کو جنگ کا میدان بنا دیتی۔ تو شاید نا واجب نہ سمجھا جاتا کیونکہ وہ اپنے حقوق کو محفوظ رکھنے کی مجاز تھی لیکن عقل نے جذباتِ غضبیہ کو مغلوب کر لیا اور اس نے باور کر لیا کہ یہ ہنگامے طبیعت کے اشتعال کا موجب ہوں گے اور زندگی کی چند مسرتیں جو حاصل ہیں یہ بھی فنا ہو جائیں گی۔ البتہ عقلی حربے استعمال کیے جائیں تو کچھ دنوں کے بعد فتح و ظفر یقینی ہے ؛

(۱۷)

خلاف معمول آیک دن سلیمان بہت چُپ چاپ تھا۔ آنکھوں کا حزن اور چہرے کی شکستگی نہانی آلام کی آئینہ دار تھی۔ دلی الجھنوں نے روزانہ تفریح سے بھی بیزار کر دیا تھا۔ اور وہ مغموم و محزون بیٹھا ہوا کسی المناک خیال میں غرق تھا۔ ٹینس کا وقت گذر کر کھانے کی ساعت آگئی لیکن اس کا استغراق بدستور قائم رہا۔ اور جب دستر خوان بچھا تو اشتہا نہیں ہے کہہ کر ڈھوانیلہ دروانسے پر پایان

طاقبت کی پستیوں کی پرکشش آنا زیں گونج گونج کر صدا بصحرا ہو گئیں۔ مگر زانو پہ جھکا ہوا سرا نچا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ آدھی رات گذر گئی۔

مریم نے اس انقلاب کو تعمق کی نظروں سے دیکھا ——— دیکھا اور غور کیا لیکن وجہ نہ سمجھ سکی طبیعت کی نادرستی کا عذر تو ایک بہانہ ہی بہانہ ہے! بات کچھ اور ہی ہے کسی سے ملال! یہ بھی نہیں وہ مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ انہیں نفرت کی طرف سے انقلابی عنصر لاحق نہیں پھر خاموشیوں کا سبب؟ اضمحلال کی وجہ؟ اس نسوانی دماغ پہ جتنا زور دیا عقدہ لاینحل ہوتا گیا۔ آخر اضطراب کی تسکین کے لئے زبان نہ رکی۔

"رات بھیگ چلی ہے کیا آرام نہ کیجیے گا؟"

سلیمان (استغراق سے چونک کر) ہاں ——— سوؤں گا ——— لیکن ابھی نیند نہیں آئی ہے!

مریم۔ آج ٹینس کھیلنے بھی نہیں گئے۔ کیا خدانخواستہ دشمنوں کی طبیعت کچھ بے مزہ ہے۔

سلیمان۔ کاش یہی ہوتا!

مریم۔ خدا نہ کرے آخر اس کا سبب؟

سلیمان۔ کیا بتاؤں کیا سبب ہے؟ بس یہ سمجھ لو کہ ساری کی کرائی محنت پہ اوس پڑ گئی!

مریم۔ خیر تو ہے کیسی محنت؟

سلیمان ۔ وکالت کا امتحان دیا تھا نتیجہ یہ نکلا۔

مریم ۔ کیا محنت نہیں کی تھی ؟

سلیمان ۔ نہیں۔

مریم ۔ پھر فیل ہونے کا سبب ؟

سلیمان ۔ یہی تو حیرت ہے۔

مریم ۔ برا نہ ملنئے تو کچھ کہوں ؟

سلیمان ۔ ضرور کہو معقول بات کا برا ماننا کیسا۔

مریم آپ نے اپنے جن دوستوں پر اعتماد کیا ہے ۔ وہ حقیقت میں آپ کے دوست اور فائدہ خواہ نہیں ہیں ۔ وہ آپ کو راہ سے بے راہ بنا و برباد کرنا چاہتے ہیں یہ انہیں کی روزانہ عنایتوں کا کرشمہ ہے کہ آپ کو قانونی کتابوں کا پورا مطالعہ کرنے کا موقعہ نہ مل سکا اور اتنے دنوں کی محنت رائگاں ہونے کے علاوہ ہمچشموں سے شرمندہ بھی ہونا پڑا۔

سلیمان ۔ اس میں ان بیچاروں کا قصور نہیں ہے ۔ خود مجھی کو قانون سے دلچسپی نہیں۔

مریم ۔ اس عذر کو تو عقل نہیں مان سکتی ۔ تمام محنت طلب کام غیر دلچسپ ضرور ہوتے ہیں مگر جب انہیں کرنے کا تہیہ کر لیا جاتا ہے ۔ تو خواہ مخواہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے ہاں ــــ یہ اور بات ہے کہ کچھ دوست نما دشمن توجہ بٹانے کی کوشش کرتے ہوئے گمراہ کر دیں ۔ انسانی فطرت برائیوں کو بہت جلد قبول کر لیتی ہے ۔ اس لئے ذرا سا سہارا

پاس سے ہی اونگھنے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہو جاتا ہے۔ اور ایسے کاموں سے طبیعت اُچٹ جاتی ہے۔

سلیمان۔ لیکن میرے احباب شریف ہیں۔ مجھے کبھی بُرا مشورہ نہیں دیتے۔

مریم۔ اگر انہیں خاندانی حیثیت سے شریف کہا جائے تو میں مان لوں گی کہ نجیب ہیں مگر فعلاً شریف ہونے میں تو کلام ہے۔

سلیمان۔ کیوں؟

مریم۔ کیا بازاری عورتوں کے کوٹھے جھانکنا۔ بیسواؤں کی چاپلوسی میں رہنا آوارہ گردی کرنا۔ عیب کو ہنر سمجھنا۔ سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک گھر سے غائب رہ کر اخلاق سوز صحبتوں میں بسر کرنا۔ اپنے ساتھ نیک مردوں کی زندگی خراب کرنا شرافت ہے؟ کیا کوئی ان حرکتوں کے بعد شریف بن سکتا ہے؟ آپ کا جو عزیز اور بیش قیمت وقت انہوں نے کسبیوں کے یہاں غارت کرا دیا۔ اگر یہی وقت کتابیں پڑھنے میں صرف ہوتا تو آپ فیل ہونے کے بدلے اول درجے میں پاس ہوتے۔ آپ کہتے ہیں۔ قانون خشک ہے، بے مزہ ہے، پھیکا ہے۔ اس کے مطالعہ میں دل نہیں لگتا۔ میں ان باتوں کو مانے لیتی ہوں مگر اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ جب آپ پڑھنے بٹھائے گئے تھے تو کیا آپ نے دلی ذوق و شوق سے اپنا سبق یاد کیا تھا؟ یقیناً اس سوال کا جواب نفی میں ہوگا۔ چونکہ اس وقت سرپرستوں کے دباؤ سے مجبور ہو کے پڑھنا پڑتا تھا پھر رفتہ رفتہ تحصیل علم سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے آج بی۔ اے ہیں۔ اگر اب بھی آپ کو بہکانے والے نہ مل جاتے اور اخلاقی دباؤ محنت کرائے جاتا تو کوئی

شبہ نہیں کہ ایل۔ ایل۔ بی بھی ہو جاتے۔

سلیمان۔ تم بالکل صحیح کہتی ہو ــــــ لیکن اس عورت کا اخلاق ہی ایسا ہے کہ مجھے زبردستی کھینچ لے جاتا ہے۔ اس خوبصورت نے تو کئی دفعہ مجھے دل لگا کر پڑھنے کی تاکید بھی کی لیکن میں ایسا کرنے سے قاصر رہا۔

مریم۔ بس یہی ایک چیز ہے جس نے آپ کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ جن باتوں کو آپ اُس کے اخلاق اور پاسداری پر محمول کرتے ہیں وہ حقیقت میں کھلی ہوئی دکانداری ہے۔

سلیمان۔ کیا تم کوئی عینی ثبوت پیش کر سکتی ہو؟

مریم۔ بڑی آسانی سے ــــــ لیکن آپ کے عتاب سے ڈر لگتا ہے۔

سلیمان۔ میں ہٹ دھرم نہیں۔ میرے پہلو میں انصاف پسند دل ہے یقین مانو۔ کئی دفعہ محض تمہارے خیال سے میں نے آمدورفت کے اس سلسلے کو قطع کرنا چاہا لیکن کوئی نہ کوئی دوست قائل کر کے لے ہی گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک اپنی آنکھوں سے کوئی بدعنوانی نہ دیکھ لوں خواہ مخواہ الزام لگانے کو ظلم خیال کرتا ہوں۔

مریم۔ بیشک، آپ کو میرا خیال ہونا چاہیئے۔ آپ کا خیال نہ کرنا میری بے نصیبی بلکہ موت کی دلیل ہے۔ خدا وہ منحوس گھڑی نہ لائے کہ آپ کے دل سے میرا خیال محو ہو۔ لیکن یہ بھی دل نہیں چاہتا کہ محض میری وجہ سے آپ کی کسی دلچسپی میں فرق آئے۔ میں تو آپ کی ایسی کنیز ہوں جو کسی حال میں شکر کے سوا شکوہ کرنا نہیں جانتی۔ درحقیقت آپ کی رضا ہی میری خوشی کا نام ہے ــــــ ہاں یہ بھی پسند نہیں آتا کہ لوگ بیٹھ

پیچھے آپ کو نام دھریں جن باتوں میں آپ کی سُبکی ہوتی تھی وہ محل دیکھ کر گوش گذار کر دیں۔ اب آپ نے ثبوت طلب کیا ہے تو اگر ایک ہفتے کے لئے مصلحتاً آپ اپنے باہر جانے کی خبر مشہور کر کے گھر میں بیٹھ رہیں تو انشاء اللہ جتنا خیال ہے اس سے زیادہ ثبوت پیش کر دوں گی۔

سلیمان۔ بہتر ہے میں صبح ہی الہ آباد جانے کی خبر اڑا دوں گا اور اگر تم نے اپنے دعوے کو سچ ثابت کر دکھایا تو عہد کرتا ہوں کہ اس وقت سے ان ہنستے چغلوں کے پاس تک نہ پھٹکوں گا اور رہی رہنے پہ اختیار کروں گا جو تمہاری نظر میں مفید اور مستحسن ہو گا۔

(۸)

سلیمان نے اقرار کے مطابق تمام دوستوں اور مہ جبین کو اپنے الہ آباد جانے کی اطلاع دے دی۔ اگرچہ انہیں محفل سُونی ہو جانے کے خیال سے اداس کیا لیکن سلیمان کو اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش اس لئے نہ کر سکے کہ اُس نے الہ آباد میں چند سے مستقل قیام کر کے قانون پڑھنے اور وکالت پاس کرنے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ البتہ بعض وہ لوگ جو، حضور، میاں اور سرکار کہہ کے مطلب نکالنے کے عادی ہوتے ہیں، انہوں نے مہ جبین کی محبت کے فرضی افسانے بیان کر کے رد کرنے کی ناکام سعی کی اور یہاں تک کہا کہ "آبائی جائداد اتنی کافی ہے کہ اس سے کوئی تجارت شروع کر کے معقول آمدنی کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے وکالت میں کیا رکھا ہے۔ دو دو روپے پر وکیل مارے مارے پھرتے ہیں"۔ مگر مریم کی گفتگو نے سلیمان کی آنکھیں

کھول دی تھیں۔ اب وہ اُن کی باتوں کو عقیدت کے کانوں سے نہیں سنتا تھا۔ بلکہ نکتہ چیں نظروں سے دیکھتا تھا۔ وہ اپنے ارادے پر ثابت قدم رہا یہاں تک کہ صحبت برخاست ہو گئی اور وہ یاران بزم اور شمع انجمن زہرہ جبین سے تھوڑے دنوں تک غیر حاضر رہنے کی معذرت کر کے مکان چلا آیا۔

مریم کامل غور کئے بغیر کوئی بات زبان سے نکالنے کی عادی نہ تھی۔ اس نے پہلے ہی اپنی ہمجولی کی معرفت اُس کے بھائی قیصر سے بات چیت کر کے زہرہ جبین کی بیوفائی ثابت کرنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ تدبیر یہ کی گئی تھی کہ قیصر جو کبھی کبھی رنگین مزاج دوستوں کی ہمراہی میں زہرہ جبین کی آستاں بوسی کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ اور اپنی اٹھتی جوانی دلفریبی جسم اور زندہ دلی کے جوہروں سے اُس کو متاثر بھی کر چکا تھا بظاہر زہرہ جبین کا پیام محبت قبول کر کے بے تکلفی پیدا کر لے اور اُس کے افسونِ نظر سے بچتے ہوئے ایسی روش اختیار کرے جس سے داؤں گھات میں لانے والا طائفہ بھی مغلوب ہو سکے اور پھر اُسے دعوت دے کر کسی ایسے مکان میں بلایا جائے۔ جہاں سے سلیمان چھپ کر اُس کی تمام حرکتوں کا معائنہ کر سکے۔

اس تدبیر پر کئی ہفتوں سے عمل درآمد شروع کر دیا گیا تھا اور جب زہرہ جبین زور و شور کے ساتھ قیصر کی محبت کا اقرار کر چکی۔ تو مریم نے سلیمان سے نمونہ پیش کرنے کی حامی بھری۔ اس اقرار کو صرف چار ہی روز گذرے تھے کہ وہ اُسے لے کر شہر سے باہر ایک باغ میں تفریح حاصل کرنے چلی گئی لیکن وہاں تفریح کے بدلے

کچھ ایسا ملال پہنچا جسے سلیمان عمر بھر فراموش نہ کر سکا۔

مرجبین نے اُسے اپنی پارسائی اور وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے حلفیہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہارے سوا دنیا کے تمام مردوں کو اپنے اوپر حرام کر لے گی۔ لیکن یہ باغ اُس وعدے کی قربان گاہ بن گیا! جہاں اُس نے وفاداری کا عہد توڑتے ہوئے کمال آزادی اور ریاکاری سے قیصر کا پہلو آباد کیا ـــــ وہ قیصر جس کی بدتمیزی اور بداخلاقی، گنوارپن اور وحشت کے مکروہ تذکروں سے بارہا سلیمان کے کان آشنا کیے جا چکے تھے۔ جس قیصر کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھنا بھی نفرت انگیز تھا! صرف یہی نہیں اُس نے قیصر کے سامنے شدید و غلیظ قسمیں کھا کھا کے اقرار کیا کہ "سلیمان کی محبت مصنوعی اور محض پیشے کے لحاظ سے تھی، ورنہ ویسے ایک وہ نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سلیمان، قیصر کی ایک چشمِ التفات پر نثار کیے جا سکتے ہیں!"

(۹)

ان واقعات نے سلیمان کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ زیادہ دیر تک ان دلخراش باتوں کا تحمل نہ کر سکا۔ اٹھا ہوا سیدھا اُس صحبت میں پہنچا۔ جہاں مرجبین قیصر کی بغل میں بیٹھی ہوئی عیش و نشاط کی داد دے رہی تھی اور شعلہ ریز آنکھوں سے گھورتے ہوئے اُس کی بے وفائی اور بدعہدی پر لعنت ملامت کی۔ اس کے پاس جواب ہی کیا تھا؟ مرجبین کی دانائی نے، مکر اور فریب کا طلسم تیار کرنے کا امکان ہی نہ رکھا تھا! ناچار لرزتی، تھرتھراتی ہوئی اٹھی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سلیمان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ وہی سر

——— جو خدا کی بارگاہ میں بھی شاذ ہی شاذ جھکتا تھا۔

سلیمان کے غضب کی آگ اس طرح نہیں بھڑکی تھی کہ رسمی خوشامد کے چھینٹوں سے بجھ جاتی لیکن مریم کی وہ سفارش کام آگئی جو چلمن کے پیچھے سے کی گئی تھی اسی وقت مہ جبین کو اپنی منحوس اور ناپاک صورت لے کر باغ سے نکل جانے کا حکم ملا اور وہ بھی جان بچی لاکھوں پائے کا ورد کرتی اور مریم کی جان و مال کو دعائیں دیتی ہوئی ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد سلیمان قیصر کی طرف متوجہ ہوا جس نے اپنا پارٹ چالاک اداکار کی طرح ادا کیا تھا۔ اس کی شریفانہ ہمدردی کا اعتراف کرتے ہوئے دلی ممنونیت اور احسان مندی کا اظہار کیا اور صاف لفظوں میں اقرار کیا کہ تم ہی وہ شخص ہو جس نے مریم کے اشارے سے ایثار کرتے ہوئے مجھے اس بلا سے ہمیشہ کے واسطے نجات دلوائی۔

قیصر نے وہی جواب دیا جو ان موقعوں پر شریف زادوں کو دینا چاہیے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مہ جبین بہت زمانے سے خفیہ پیام و سلام کیا کرتی تھی لیکن میں نے آپ کے لحاظ سے کبھی اس کی التجاؤں پر التفات نہیں کی میں ان سے سہما ہوا ہمیشہ پناہ مانگتا رہا لیکن بھابی کی ہمدردی اور آپ کے مستقبل کے خیال نے مجبور کیا کہ گندم نما جو فروش دوستوں کی دشمنی اور مہ جبین کی ریاکاری کا پردہ فاش کر کے یہ راز ظاہر کر دوں کہ بیسوا ہر حال میں بیسوا ہی رہتی ہے۔

خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہونے کے بعد یہ کامیاب قافلہ عصیاں کی آلودگی سے پاک

صاف یہ مکان واپس آیا پھر کیا ہوا؟ اسے ظاہر کرنے کے لئے یہ چند جملے کافی ہیں۔ سلیمان نے تھوڑے دنوں کی محنت اور توجہ میں وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ اور نہایت کامیاب وکیل بن گیا جس زہریلی فضا نے اُس کے ابتدائی ایام کو مسموم کر دیا تھا اس کے لئے مریم کے حُسن تدبیر نے تریاق کا کام کیا اوباش دوستوں کی انجمن منتشر ہو گئی اور اس کی جگہ اعلیٰ سوسائٹی قائم ہوئی۔ اب خدا کے افضال سے سلیمان کا شمار شہر کے عمائد میں ہوتا ہے اور یہ اعزاز اس کی ہونہار اور شریف بیوی مریم کا طفیل ہے۔:

پالش والا

(۱)

شام کا سہانا ہنگام تفریح کے لئے مخصوص تھا، میں جلد جلد ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد لباس تبدیل کر کے سیر کو نکل گیا، شہر کی خوبصورت بازاریں، تجارتی اصول پر سجی ہوئی دکانیں، نظر فریبی کا جال بچھائے، ادھر سے گزرنے والوں کو اپنی رعنائی و زیبائی کی مسحور کن کشش میں جذب کر رہی تھیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اکثر فیشن نواز بے ضرورت بھی باپ دادا کا اندوختہ اُن کی خریداری میں تلف کر رہے تھے میں ان سبق آموز مناظر سے متاثر ہوتا ہوا فرحناک تفرج گاہوں میں داخل ہوا اور وہاں کی صحت آفریں فضا سے مستفید ہوتا ہوا تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے میں گھر کی طرف واپس ہوا۔ یہ بالمرہ کا معمول تھا جس میں خاص خاص اوقات کے سوا کبھی فرق نہیں پڑتا تھا، چراغ جلنے کے بعد گھر آ کے گھنٹہ دو گھنٹے بے تکلف احباب سے کسی لطیف و دلچسپ موضوع

پر گفتگو رہتی تھی۔ اس کے بعد آرام کا وقت آجاتا تھا لیکن ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا جسے بیان نہ کرنا شاید میرے امکان سے خارج ہے۔

مکان میں داخل ہونے کے ارادے سے جیسے ہی دروازے میں قدم رکھنا چاہا، ویسے ہی کسی طرف سے ایک شکستہ حال لڑکے نے سامنے آکے سلام کیا! اس کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ سال کی تھی۔ گلے میں ایک پھٹا کرتا اور پیوند دار شیروانی تھی۔ مگر اتنی ڈھیلی جو کسی طرح اس کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ گمان ہوتا تھا کہ کسی سخی داتا نے زدہ حالت پر ترس کھا کے اپنی اترن عنایت کر دی ہے، جو استعمال کی کثرت سے اس حال کو پہنچ چکی ہے۔ پاؤں میں ایک پیوند دار پائجامہ تھا۔ وہ بھی حق رفاقت ادا کر چکا تھا اور عنقریب ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور ہونے والا تھا۔ موسمی برودت نے اس کے نازنین جسم کو پالا مارے ہوئے پودے کی طرح خشک کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹین کا بکس تھا جسے مضبوطی سے سنبھالے تھا۔

میں نے ظاہری وضع دیکھ کے اس کو فقیر تصور کر لیا۔ چونکہ ردی حالت اس کی عسرت زدہ زندگی کی آئینہ دار تھی اور "شکستگی" اعانت کی سفارش کر رہی تھی۔ اس لئے سوال کرنے سے پہلے ہی میں نے جیب سے اکنی نکالی اور بکمال بے پروائی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اس وقت کی حیرت بیان کے قابل نہیں۔ جب وہ اس طرح جھجک کے پیچھے ہٹ گیا گویا میری مٹھی میں اکنی کے بدلے زہریلا سانپ دبا ہوا ہے! میں حیران ہوکے اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس نے حسرت آلود نظروں سے مجھے تاکتے ہوئے

خودداری کی شان سے کہا۔

"جناب! میں فقیر نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو؟" میں نے تعجب آمیز لہجے میں دریافت کیا۔ اس نے کسی قدر فخریہ طور پر جواب دیا۔

"ایک غریب پالش والا۔ آج کا سارا دن پھیری لگاتے گذرا لیکن کہیں کام نہ ملا۔ آہ! بیچارہ نعیم میرا منتظر ہوگا!"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"آپ کے جوتے گرد آلود ہو رہے ہیں جو صرف دو پیسے میں آئینے کی طرح چمک سکتے ہیں۔"

"میرے یہاں پالش کا سامان موجود ہے اور میرا خادم ہر روز دن میں ایک مرتبہ یہ خدمت انجام دیتا ہے۔"

"لیکن وہ اتنی صفائی نہیں کر سکتا جتنی میں کر سکتا ہوں۔"

"اس کا سبب؟"

"بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ اپنی روزی سے مطمئن ہے اور میں غیر مطمئن!"

(۲)

اس کی شریف صورت، شفیم حالت اور شائستہ گفتگو نے مجبور کیا کہ میں اس کی اعانت کا فریضہ ادا کروں۔ اس لئے اسے عقب میں آنے کا اشارہ کرتا ہوا مکان میں داخل ہوا اور بیٹھک میں پہنچ کے جوتا اس کے حوالے کیا۔ وہ چوکھٹ کے پاس بیٹھ گیا۔

بکس کھول کے سامنے رکھ لیا۔ اس کے اندر کوبرا پالش، برش اور جھاڑن سلیقے سے رکھے تھے۔ اس نے جوتوں کی ڈوریاں کھول کے اندر لا گرد صاف کی پھر بڑی تمیز داری سے پالش لگا کے برش پھیرنا شروع کیا۔ چند منٹ کے وقفے میں دونوں جوتے شیشے کی مانند جھلکنے لگے۔ اگرچہ میرا ملازم روزانہ جوتے صاف کرتا تھا لیکن اس سے کبھی اتنی صفائی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ پالش والے نے تھوڑی دیر قبل جس خیال کا اظہار کیا تھا وہ لفظ بلفظ صحیح ثابت کر دکھایا۔ چونکہ اس کی شریف صورتی اور شائستگی پہلے ہی متاثر کر چکی تھی اور اب محنت و مستعدی نے میری ہمدردی کے جذبے کو بخشش اور بخشش کر دیا۔ میں نے اس کی مطلوبہ اجرت دو پیسوں کے بدلے وہی اکنّی جو فقیر سمجھ کے دینا چاہی تھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لڑکے! تمہارے کام نے مجھے بہت خوش کیا۔ واقعی! تم سچے اور محنتی لڑکے ہو۔ اس لئے میں نے تم کو دونّی اجرت دینا منظور کیا ہے کل سے تم ہر روز شام سے کچھ پہلے یہاں آکے جوتے صاف کر جایا کرو مجوزہ اجرت روز کی روز تم کو مل جایا کرے گی"

لڑکے نے شکر گذار نظروں سے میری طرف دیکھا گویا اس کریمانہ سلوک پر اپنی ممنونیت کا اظہار کر رہا ہے۔ پھر پالش کی ڈبیا، برش، جھاڑن احتیاط سے بکس میں محفوظ کر لیا اور ادب آموز عنوان سے فرشی سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

اس دن سے وہ روزانہ شام سے کچھ پہلے میرے یہاں حاضر ہو کے جوتوں پر پالش پھیر جایا کرتا تھا۔ جتنی آمد و رفت بڑھتی جاتی تھی اتنے ہی اس کے شریفانہ جوہر بے نقاب

ہونے لگے۔ اس کی ذات میں محض محنت و دیانت ہی کی صفات موجود نہیں بلکہ غیرت اور خودداری بھی کافی طور پر پائی جاتی تھی۔ اس کی ظاہری حالت باطنی کیفیت سے بالکل مختلف تھی۔ وہ تجارت کی طرف بہت زیادہ راغب تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خواہش بھی تھی کہ قوتِ بازو سے ترقی کا سامان ملے کہے: یہی باعث تھا کہ میرا مالی احسان لینا گوارا نہ ہوا اور جب کبھی میں نے کچھ دینے کا ارادہ کیا تو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کیا۔ ایک روز وہ معمولاً جوتوں پر پالش پھیرنے آیا۔ اتفاق سے اس دن مجھے ایک دوست کا انتظار تھا جو اس وقت ایک ضروری معاملے پر گفتگو کرنے والے تھے۔ اس لئے یہ انتظاری کا عزم فسخ ہو چکا تھا۔ پالش والا اپنی خدمت سے فارغ ہو کے جانے لگا۔ از بسکہ اس کی بات چیت میں حلاوت محسوس ہوتی تھی میں نے خالی وقت اس کی مہذب باتوں میں گزارنا طے کیا اور اسے آواز دی۔ وہ فوراً واپس آیا۔ میں نے کمال مہربانی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پائین فرش دوزانو ہو بیٹھا۔ میں نے سوال کیا۔

"بھلا اس کام میں ہر روز کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟"

"پہلے گاہکوں کی کمی تھی، مگر اب زیادہ سے زیادہ چھ آنے اور کم سے کم دو آنے روز مل جاتے ہیں۔"

"ان پیسوں کو کیا کرتے ہو؟"

"کھانے پینے میں صرف کرتا ہوں۔"

"کیا سب خرچ کر ڈالتے ہو؟"

"جی نہیں! آدھی آمدنی خوراک میں صرف ہوتی ہے۔"

"نصف آمدنی کیا کرتے ہو؟"

"اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصّہ نعیم کی تعلیم میں لگاتا ہوں اور دوسرا سیونگ بنک میں جمع کرا دیتا ہوں۔"

"وہ نعیم! تم بہت سمجھدار لڑکے ہو ــــــ ہاں! نعیم تمہارا کون ہے؟"

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کا سن صرف نو برس کا ہے اور خدا کے بعد میرے سوا کوئی پرسان حال بھی نہیں ہے۔"

"کیا تم ملازمت پسند کرتے ہو؟"

"بالکل نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں نوکری پر تجارت کو ترجیح دیتا ہوں۔"

"اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔"

"اسی لئے آمدنی سے تھوڑا تھوڑا پس انداز کر رہا ہوں۔"

"اچھا بس ــــــ جب تمہیں میری امداد کی ضرورت محسوس ہو تو کہنا۔"

(۳)

پالش والے کے ان خیالات نے میرے جذبات میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اور

بے اختیار دل سے آواز پیدا ہوتی کہ شریف لڑکے! خدا تیرے عزائم کی تکمیل کرے۔

اگر قوم میں اس خیال اور اس قلب و دماغ کے افراد پیدا ہونے لگیں تو وہ یقیناً اپنے اعمال سے اسلاف کے محو ہو جانے والے کارناموں کو نئے سرے سے تازہ کر سکتے ہیں اور ہم گمنامی کے ماحول سے نکل کے زندہ قوموں کے ہمدوش ہو سکتے ہیں۔ ہماری مٹی ہوئی تجارت ایک دفعہ پھر فضائے عالم میں فروغ پا سکتی ہے۔ لیکن ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

میں دیر تک تخیل میں ڈوبا رہا حتیٰ کہ میرے دوست آئے اور پالش والا گھر واپس گیا۔ دوست کو جس بابت میں تبادلۂ خیال کرنا تھا کیا اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے مرخص ہوئے۔ اسی طرح دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے بنتے رہے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا پالش والے سے مؤانست آتی گئی۔ جب وہ آتا تھا میں شوق کی پیاس بجھانے کو روک کر تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ضرور کر لیتا تھا۔ گفت و شنید کے سلسلے میں یہ بھی معلوم ہوتا کہ اب اس کا کام بتدریج ترقی کر رہا ہے۔ آمدنی کی فراوانی سے اُس نے تحصیل علم بھی شروع کر دی ہے اور شب کو ایک نائٹ اسکول رات کا مدرسہ ا۔ میں پڑھنے جاتا ہے۔ اس کا نام حلیم ہے حقیقت میں وہ غصہ کرنا جانتا ہی نہیں۔ وہ کمسنی میں یتیم ... ہو گیا تھا ظالم چچا نے امانت میں خیانت کی اور اس کے باپ کا متروکہ غصب کرنے کے بعد اُسے اور اُس کے چھوٹے بھائی نعیم کو گھر سے نکال دیا۔ بے گھر ہونے کے وقت حلیم کی انگلیوں میں دو چاندی کی انگوٹھیاں تھیں۔ ان انگوٹھیوں

کواڑوں نے پونے نیچ کے پالش کا سامان خریدا اور دن کو کچہریوں، کارخانوں، کالجوں اور اسکولوں میں جا کے جوتے صاف کرنا شروع کئے اور سہ پہر سے بازاروں میں گھوم پھر کے کام جاری کیا۔ رفتہ رفتہ آمدنی کی صورت نکل آئی اور دونوں بھائی غربیانہ بسر کرنے لگے۔ کفایت شعاری اور سلیقہ مندی اُس میں بخوبی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ محنتی اور جفاکش بھی تھا۔ انہیں اوصاف کی بدولت اس نے دو برس میں تھوڑا بہت سرمایہ جمع کر لیا اور اتنے دنوں کی مزاولت میں شُدبُد لکھ پڑھ بھی گیا۔ حساب کتاب میں بھی کچھ مداخلت حاصل کر لی۔ اب اُس کی فطری ہمت نے ایک اور قدم بڑھانا چاہا اور اس نے تجارتی دنیا میں قسمت آزمائی کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ ایک روز معمول کے مطابق میرے یہاں آیا اور روزانہ خدمت سے فارغ ہونے کے بعد مجھ سے کہا۔

"آج آپ کو ایک قدیم وعدہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔"

"کیسا وعدہ؟"

"امداد کے متعلق۔"

"شوق سے ـــــ کہو مجھے کس طرح مدد کرنا چاہیئے؟"

"ضرورت کے موافق روپے کا انتظام ہو چکا ہے آپ سے محض سفارش کا امیدوار ہوں!!!"

"نہایت خوشی سے۔"

"فی الحال کباڑیہ کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کثیر الاحباب ہیں۔ اپنے دوستوں سے

سفارش فرمادیجیے کہ وہ اپنے گھر کی نکمی اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں مجھے عنایت کر دیں ، میں بہت جلد انہیں فروخت کر کے اپنا کمیشن لینے کے بعد قیمت حاضر کر دیا کروں گا۔"

"اس کام میں شدید محنت کرنا ہو گی۔"

"اس کے لیے میں پہلے ہی سے آمادہ ہو چکا ہوں۔"

(۴)

گدڑی بازار میں نیا کباڑخانہ کھل گیا۔ حلیم نے اس کام میں کمال ہوشیاری، دیانت اور محنت کا ثبوت پیش کیا۔ میں نے جن احباب سے سفارش کر کے پرانا مال دلوایا تھا۔ وہ سب اُس کی دیانت داری کے مداح تھے۔ چونکہ انہیں بھی ایسی اشیاء کے دام وصول ہونے لگے تھے جو بظاہر کسی مصرف کی نہ تھیں۔ اس لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کہنہ و بوسیدہ چیزیں حلیم کے لئے رکھ چھوڑتے تھے۔ ایک دوسرے سے اس کا تذکرہ کر کے ترغیب و تحریص کرتا تھا۔ ان وجوہ سے وہ بہت جلد مشہور ہو گیا۔ جہاں کوئی چیز خراب و خستہ یا مصرف سے بیکار ہوتی تھی وہ حلیم کے واسطے جگہ کر رکھ لی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے افراط سے مال ملنے لگا اور وہ اسے قلیل منافع پر جلد جلد فروخت کرنے لگا۔

اب اس نے بوٹ پالش کا پیشہ ترک کر دیا تھا۔ گدڑی بازار میں اس کی دُکان تمام دکانوں سے بہتر حالت میں تھی۔ خریدار اس کی بات سخنی اور معاملت کی صفائی سے بہت خوش تھے صبح اور شام کو اس کی دکان کے سامنے گاہکوں کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے دکان جمانے کے بعد اس نے اسٹیشنری کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ ٹھیک فروشوں

سے مال لے کے اسکولوں، مدرسوں اور کالجوں نیز بڑے بڑے کارخانوں میں آرڈر سپلائی کی تعمیل فرمائش کرنے لگا تھا۔ اس نے بڑی دانائی سے اپنے اوقات کی تقسیم کر دی تھی۔ ۶ بجے صبح سے دس بجے دن تک کتابیں بیچنے کا کام کرتا تھا، پھر ایک گھنٹہ آرام کر کے گیارہ بجے اسٹیشنری کا سامان لے کے نکل جاتا تھا اور تین بجے تک بڑے بڑے کارخانوں اور اسکولوں کا چکر لگایا کرتا۔ اس کے بعد چار بجے شام سے آٹھ بجے رات تک پھر دکانداری کرنے میں مصروف رہتا تھا۔

اس درمیان میں وہ تحصیل علم کی طرف سے بھی غافل نہیں رہا۔ اس نے ایک ماسٹر کو نوکر رکھ لیا تھا جو ساڑھے آٹھ بجے رات سے ساڑھے نو بجے شب تک درسیات کی کتابیں پڑھاتا تھا۔ اب وہ مفلوک الحال پالش والا نہ تھا بلکہ متوسط حیثیت کا ایک تاجر تھا۔ اس نے چھوٹا سا ایک گھر بھی خرید لیا تھا اور فراغت سے بسر کرنے لگا تھا۔

ان دنوں جب حلیم جلد جلد عروج کی منزلیں طے کر رہا تھا، تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے مجھے سفر کی ضرورت پیش آئی اور ایک غیر معین مدت کے لیے نقلِ سکونت کرنا پڑی۔ اگرچہ حلیم کے حالات سے یک گونہ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لیکن معیشت کے سلسلے نے مجبور کر دیا اور مجھے پردیس میں طویل زمانہ بسر کرنا پڑا۔ اس عرصہ میں بارہا حلیم کا خیال آیا، مگر واقعات نے اسے عمل کا لباس نہ پہنانے دیا۔ مختصر یہ ہے کہ اس طول و طویل مدت میں ایک دفعہ بھی حلیم کی خیر خبر دریافت نہ ہو سکی۔ پرکار کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک سے دوسرے مقام تک منتقل ہوتا رہا، قطب کے مانند کہیں قدم جمانا

نصیب نہ ہُوا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ گزشتہ واقعات کی یاد محو ہونے لگی۔

(۵)

انسانی زندگی میں بہت سے چھوٹے چھوٹے اہم ترین واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جو بادی النظر میں کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور حافظہ انہیں بہت جلد فراموش کر دیتا ہے۔ اگر احساس و ادراک کی روشنی میں ان پر تبصرہ کیا جائے۔ تو ان سے عملی روح کو بیدار کرنے کا عجیب و غریب مواد حاصل ہو سکتا ہے مگر زمانے کی غفلت پاشیاں ہر کس و ناکس کو ان پر غور و فکر کر کے سبق لینے کا موقعہ نہیں دیتیں اور وہ بشریت کے فراموش کن خصائل میں جذب ہو کے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔

یہی صورت حکیم کے معاملات کی پیش آئی۔ باوجود اس کے حالات سے دلچسپی رکھنے کے بھی چند سال کی مصروفیت نے اس کی یاد کو محو کر دیا اور آئندہ اس کے متعلق تفتیش کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہُوا۔ زمانہ اپنی معینہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور دنیا دن دن پرانی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ میں ملازمت کی اس آخری منزل تک پہنچ گیا جس کے بعد فرائض سے سبکدوش کرتے ہوئے وظیفہ پنشن عطا کر دیا جاتا ہے اور ذہن میں سے کاروباری مصروفیت ختم ہو کے پُرسکون زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

پورے پندرہ برس مختلف شہروں کا دانہ پانی کھانے پینے کے بعد بال بچوں کو لے کے وطن واپس آیا اور بسر گزر کرنے کے قابل ایک گھر بنا کے امن و امان کی زندگی

بسر کرنے لگا۔ معلوم ملازمت کے دوران میں کتنے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔ جن کی صحبت بادی النظر میں ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن زمانے کا سیلاب اُس یک رنگی کو بہالے گیا حتیٰ کہ ان کے نام تک یاد نہ رہے۔ گویا مجلس کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ نئے نئے دوست احباب پیدا ہو چکے تھے۔ معاش کی جانب سے توپنشن نے بے فکر ہی کر دیا تھا۔ رہی اولاد؟ وہ خدا کی مہربانی سے اپنے اپنے کام میں لگ چکی تھی اور مجھے یکسوئی کے ساتھ اللہ اللہ کرنے کے سوا کوئی کام باقی نہ تھا۔

ایک دن شام سے کچھ پہلے مجھے وزیٹنگ کارڈ ملا۔ اس کارڈ پر "علیم الدین مرقوم تھا۔ میں نے حافظے پر زور ڈالا لیکن بالکل یاد نہ آیا کہ میرے شناساؤں میں کوئی علیم الدین بھی شامل ہیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد بیٹھک کے پہنچا۔ وہاں تیس بتیس برس کے ایک وجیہہ شکیل جوان کو منتظر پایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اکرامًا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اپنی متجسس نگاہیں اُس کے جمیل چہرے پر گاڑ دیں۔ اُس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے اس شکل و شمائل کے کسی شخص کو پہلے دیکھ چکا ہوں۔ دفعتہً ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ مگر میں اس خیال کو زبان سے ادا نہ کر سکا۔ کیونکہ میرا ملاقاتی کوئی عمومی آدمی نہ تھا۔ اُس کی انگلیوں میں الماسی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ نفیس لباس ثروت و امارت کا آئینہ دار تھا اور کھڑکی سے اس کی بیش قیمت موٹر کار نظر آرہی تھی۔ جو زریں پوش شوفر کی حفاظت میں میرے دروازے پر کھڑی اپنے مالک کا انتظار کر رہی تھی۔ جب تک

میں اس کی صورت پر نظریں جمائے رہا۔ وہ چپ چاپ کھڑا مسکراتا رہا۔ اس کا تبسم دل پسند تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح مسکرائے جائے اور میں دیکھا کروں۔ آخر چند لمحوں کا توقف کر کے میں نے اجنبیت نما انداز سے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک کرسی کھینچ کے خود بھی بیٹھ گیا۔ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا:۔

"شاید آپ نے اپنے قدیم نیازمند کو نہیں پہچانا؟"

(۶)

اس سوال نے غیر ارادی طور پر میری توجہ پالش والے لڑکے کی طرف پھیر دی۔ واقعی! وہی حلیہ تھا، وہی آواز! پندرہ سال کی مدت انسانی پیکر میں جتنا انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔ اتنا ہی تفرقہ اس کی صورت میں نظر آتا تھا۔ میں نے دلی انبساط ظاہر کرتے ہوئے کہا

"بیشک میں نے پہلے تو شناخت کرنے میں ضرور غلطی کی۔ مگر اب پہچان لیا ——— کہو اچھے تو رہے؟ خدا کے فضل سے تمہاری حالت میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔ فی زمانہ یہاں کا سب سے بڑا تاجر شمار ہوتا ہوں۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں تجارتی کوٹھیاں موجود ہیں۔"

اور .... وہ .... کمبائنڈ ....

اس نے مجھے ہچکچاتے دیکھ کے جلدی سے جواب دیا۔

ہنوز وہ دکان موجود ہے۔ اگرچہ اس کی ظاہری صورت میں بڑا تفاوت ہو گیا ہے۔ میں نے وہ مکان خرید کے نئے سرے سے بنوایا ہے۔ آپ کی دعا سے نعیم گریجویٹ ہو گیا ہے اور خوشنما کارڈ پیش کرتے ہوئے اسی مہینے میں اس کے عقد کی تقریب قرار پائی ہے۔ آپ کو شرکت کرنا ہو گی۔

میں بہت خوشی سے شریک ہوں گا (رفع ندامت کے لئے) مجھے تمہارا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ ورنہ بہت پہلے مل کے سب حالات دریافت کرتا۔"

آپ کی نوازش ہے۔ ورنہ آپ کو تلاش کرنا میرا فرض تھا۔ اگرچہ میں نے مصروفیت کے باوجود اس فریضے کو ادا کرنے میں تغافل نہیں کیا لیکن آپ کا سراغ نکالنے میں آج صبح سے پہلے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔"

مجھے تمہاری سعادت مندی سے یہی امید تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ہمت و عمل کا بہترین نمونہ ہو۔ قوم کے افراد کو تمہاری تقلید کرنا چاہیئے۔ کیونکہ تمہارے نقوشِ قدم پہ چلنا ان کی اقبال مندی کی دلیل ہے۔"

حلیم نے سر جھکا کے سکوت اختیار کیا۔ میں نے چائے تیار کرائی۔ ہر چند وہ اس تکلف پر راضی نہ تھا لیکن میرے اصرار سے قبول کرنا پڑا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا خائن چچا غصب کیا ہوا تمام سرمایہ تلف کرنے کے بعد روٹیوں کو محتاج ہو چکا تھا لیکن اس نے چچا کی بے عنوانیوں سے درگزر کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے۔ اور اپنے مرحوم باپ کی طرح اس کی عزت کرتا ہے۔ کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں

کہتا جس سے اُس کے جذبات کو ٹھیس پہنچے ساہو صاحب اسی کی لڑکی سے نعیم کا عقد ہونے والا ہے۔

عقد کی تقریب میں کافی تکلف برتا گیا خصوصاً ولیمے کی دعوت اتنے وسیع پیمانے پر ہوئی جس کی نظیر ملنا محال ہے۔ سربرآوردہ اور تمام مسلمانوں کے علاوہ غیر مذاہب کے لوگوں کو بھی ان کے قومی اصول پر کھانا کھلایا گیا اور متواتر تین شبانہ روز عوام الناس میں یہ الوانِ نعمت کی تقسیم جاری رہی ؛

شرافتِ نفس

(۱)

دوپہر کا پُرجلال آفتاب اُفقِ گردوں سے ضیا باری میں مصروف ہے۔ دنیا کا گوشہ گوشہ زریں چادر کے سائے میں کام کر رہا ہے۔ اشرف نے ابھی ابھی کھانے سے فراغت پائی ہے اور لائبریری روم میں چکّردار کرسی پر بیٹھ کر اخبارات و جرائد کے مطالعہ میں مشغول ہو چکا ہے۔

آج مکان میں وہ تنہا ہے اور اتوار نے کاروباری مصروفیتوں سے آزادی دے کر تھکے ہوئے دل و دماغ اور شل ہو جانے والے ہاتھ پاؤں کو سستانے اور آرام لینے کا موقع دے دیا ہے۔

اس کی خلوت کو دل چسپ باتوں سے معمور و مسرور کرنے والی پری چہرہ دگل اندام

جمیلہ جو اس کی قسمت کے پانسہ کو حسنِ تدبیر سے پلٹتے ہوئے رنج و راحت، عروج
و زوال میں برابر کی حصہ دار بن چکی ہے۔ دن بھر کے واسطے پیاری سہیلی نگہت کی ملاقات
کو گئی ہے جو رازدار ہونے کے علاوہ اس کے عزیز ترین عم زاد بھائی متین
کی رفیقۂ حیات بھی ہے۔

عقد کی مبارک ساعت کے بعد سے مفارقت کا یہ پہلا اتفاق ہے جس نے
سجے سجائے بارونق محل کو ویران و عبرت زا کھنڈر بنا کر پیش کر دیا ہے۔ اخبار کھلا
پڑا ہے۔ خبروں کی موٹی موٹی سرخیاں نظروں کو کبریائی کشش سے کھینچنا چاہتی ہیں۔
لیکن دل کی برگشتگی اُدھر سے منہ پھیرے دیتی ہے۔ آنکھوں اور اخبار کے مابین
ایک مجسمۂ حسن حائل ہے جو تمام امور سے بے نیاز کر کے صرف اپنی طرف رجوع
رکھنا چاہتا ہے۔

اشرف! ___ اشرف جو محبت کا دم بھرنے کے علاوہ احسانوں کے بوجھ سے
بھی دبا ہوا ہے پیکرِ حسن و ناز کی پرستاری سے کیوں کر اغماض کر سکتا ہے بظاہری
اور فنا ہو جانے والی آنکھوں سے نہیں بلکہ دیدۂ دل سے دیکھتا ہے جن کی بینائی
خاک ہو جانے کے بعد بھی زائل نہیں ہوتی اور سچے پجاری کی طرح سرِ تسلیم و رضا خم
کر دیتا ہے۔ دل کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ زندگی کے واقعات سینما کی
متحرک تصویروں کی طرح گزرنے لگتے ہیں۔ اور وہ عالمِ تخیل میں پہنچ کر
کھو جاتا ہے:۔

(۲)

اشرف کے والد نے بے قیاس متروکہ پایا تھا۔ مشہور تھا کہ مٹھیاں بھر بھر کے دولت لٹائیں گے تو بھی سات پشتوں تک کمی نہ واقع ہو گی۔ ان اعتبارات سے اُن کے کان ناآشنا نہ تھے۔ انہیں اپنی امارت پر بجا ناز تھا اور آخر کار اسی کبر آمیز افتخار نے غرور کا سر نیچا کر دیا۔ ان کی دولت کنکر پتھر بن گئی۔ اور وہ تباہ و برباد ہو گئے! مفلسی کی حالت میں فوت ہو گئے اور اپنے اکلوتے بچے اشرف کے لئے بجز ایک مسکونہ مکان کے کچھ نہ چھوڑا۔ مکان بھی وہ مکان جس پر اصل سے زیادہ قرض کا بار لدا ہوا تھا اور چالیسویں کی فاتحہ کے ساتھ ہی نیلام پر چڑھ کر بہاجن کی ملکیت میں داخل ہو گیا۔

اشرف سمجھدار تھا۔ ذکی و فہیم تھا۔ بچپن کے غفلت آگین زمانے سے نکل کر شباب کی کیف آفرین فصل میں قدم رکھ چکا تھا۔ عضو عضو، رگ رگ سے جوانی کا جوش ابلا پڑتا تھا۔ لیکن وہ سارا جوش و خروش افلاس و ادبار کے شکنجے میں جکڑ کر فنا ہو جانے پر مجبور تھا۔ دل کے بڑھتے ہوئے ولولے ترقی کی ترغیب دیتے، یاس پیل عروج کی منزل پر سیاہ چادر تان کر راستہ روکتیں اور وہ بحر تفکر میں ڈوب جاتا۔ وہ شریف کا بچہ اور شریف اعتبال تھا۔ اس کی غیرت کو گوارا نہ تھا کہ جہاں امیر الامرا بن کے بسر کی ہو وہاں مخالفین کے تیر ملامت کا نشانہ بنے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جلد از جلد شہر چھوڑ کر بیک بینی و دوگوش کسی جانب نکل جانا چاہتا تھا۔

اس ارادے کی تکمیل میں بڑی مشکل یہ حائل تھی کہ مرنے والے نے حیات ہی میں اس کو ننھیالی عزیز کی ایک لڑکی سے منسوب کر دیا تھا۔ منگنی کی رسم تو امیرانہ دھوم دھام سے ادا ہو چکی تھی، ہنوز عقد کا مرحلہ باقی تھا۔ چونکہ لڑکی سیانی ہو رہی تھی اور اس کے والدین متقاضی تھے لیکن اشرف کے والد کو امراض کے حملوں اور زمانے کے انکار سے فرصت نہ ملی کہ ہونہار فرزند کا سہرا دیکھ سکتے۔ عقد کی تقریب وعدۂ فردا کی نذر ہوتی رہی اور فرمانِ قسمتِ قدر پورا ہو گیا۔

اشرف سے بھی دلہن والوں نے تقاضا کیا لیکن اس نے ایسی کلی کو جو مائل بہ شگفتگی ہو گلے کا ہار بنا کر سمومِ افلاس کے تند و تیز جھونکوں سے پژمردہ کرنا پسند نہ کیا۔ اس کی فطری حمیت نے نہ چاہا کہ ایسی لڑکی کو جس نے زندگی کی اولیں بہار میں ابھی قدم رکھا ہے اپنے دامن سے وابستہ کر کے افلاس و ادبار کا شکار بنائے اور شادمانیوں کو ہموم و غم کے قالب میں تبدیل کرنے کا مرتکب ہو یا خود... سسرال کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرتے ہوئے کاہل زندگی گزارے۔ انجام کار انہیں خیالات کے ماتحت رشتہ توڑ کر بمبئی کی طرف تقدیر آزمائی کے لیے چل کھڑا ہوا۔

(۳)

ہر چند بمبئی نہ صرف شہر اور ہندوستان میں سب سے بڑی تجارت گاہ ہے لیکن اشرف کو یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کی اجنبیت نے کسی تاجر کی چشمِ التفات حاصل نہ کی۔ اگرچہ اس نے کوشش کا کوئی لمحہ ضائع نہ کیا۔

صبح سے اٹھ کر شام تک فکر معاش و تلاش روزگار میں بازاروں اور گلی کوچوں کی خاک چھانی۔ بڑے بڑے تاجروں کی آستاں بوسی کرتا پھرا۔ مگر نارسا بخت نے کسی دہلیز تک رسائی نہ ہونے دی۔

وہ پڑھا لکھا تھا، محنتی و جفاکش تھا، امیرانہ پرورش نے اس کے قوائے بدنی کو معطل نہیں کیا تھا۔ اس کی ذات میں ایمانداری اور دیانت کے جوہر وہاں کی بھی کمی نہ تھی۔ وہ فرض شناسی کے اصول سے بھی واقف تھا۔ تاہم بستی والوں کے لئے اجنبی ضرور تھا۔ وہاں کے ایک متنفس کو بھی اس کے ذاتی محاسن کا تجربہ نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ اشرف کے خوبصورت و وجیہہ چہرے پر کشش مغموم آنکھیں، سڈول جسم، متناسب اعضا اور شان سب سے بڑھ چڑھ کر ٹھٹھتی ہوئی جوانی پر ترس کھانے کی صورت میں بھی کسی طرح کی امداد نہ دے سکے۔

دن ہفتوں سے ہفتے مہینوں سے بدل گئے مگر اشرف کی بگڑی ہوئی قسمت کا ستارا نہ چمکا۔ وہ جتنا سرمایہ وطن سے بچا کر لایا تھا۔ باوجود انتہائے جزرسی کے بھی ختم ہو گیا۔ اور اب فاقہ کشی کی روح فرسا مصیبت کا بھی نزول شروع ہو گیا۔ بھیک مانگنا حمیت کے خلاف تھا۔ نوکری ڈھونڈنے کی عادت نہ تھی۔ مگر تقدیر سے زور نہیں چلتا۔ وقت مجبور کرتا ہے۔ ضرورت چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اشرف نے بھی پیٹ کی دوزخ پاٹنے کے واسطے ڈلیا اٹھائی۔

ہر کام کے لئے تجربہ شرط ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ ہر شخص مزدور کی طرح

فرائض انجام دے سکتا ہے۔ اشرف نے بساط سے زیادہ مشقت کی مگر پیشہ ور مزدوروں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ جہاں گیا اُجرت کم محنت زیادہ۔ پھر ستم یہ کہ ٹھیکیدار کے تیور سیدھے نہیں۔ تاہم ضرورت نے جملہ سختیوں کے تحمل پر مجبور ہی رکھا۔

ایک دن اُسے کسی اخبار کا بچا ہوا ورق مل گیا۔ پھینکا جانے کی بھٹی میں اس نے مضمون پڑھا۔ خصوصاً "ضرورت ہے" کا عنوان جاذب توجہ تھا۔ اس سرخی کے تحت "مسٹر متین" نامی نوجوان کی جانب سے اعلان کیا گیا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ متدین نوجوان کی ضرورت ہے۔ پتہ درج تھا۔ اشرف نے اس ورق کو لپیٹ کر کمر میں رکھ لیا۔ اگرچہ اطلاع شائع ہوئے کئی روز گذر چکے تھے لیکن موہوم امید پر اُس نے متین سے ملاقات کرنا طے کیا۔

۴۱

اشرف نے کام سے چھٹی پائی تو گھر جانے کے بدلے سیدھا چوپاٹی پہنچا۔ اخبار میں لکھے ہوئے پتہ پر پہنچ کر متین کو دریافت کیا۔ خادموں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ وقت ہوا خوری کا ہے۔ رات کو واپسی ہو گی، اس وقت ملاقات ہونا محال ہے۔ صبح آٹھ بجے سے گیارہ بجے دن تک ملنے کا وقت مقرر ہے۔

اشرف بے نیل مرام گھر واپس ہوا۔ اگر صبح کو متین سے ملنے جاتا ہے تو کم سے کم آدھے دن کی اجرت کا نقصان ہوتا ہے۔ شام کو ملاقات نہیں ہو سکتی۔ قیام گاہ میں پہنچ کر اسی پس و پیش میں مبتلا رہا۔ وہ ادنیٰ حالت سے ترقی کرنا چاہتا تھا۔ اسے

دنیا اٹھانے کی زندگی پسند نہ تھی۔ اُس کے دل نے گزشتہ ثروت کو واپس لانا چاہتے تھے اور اس سعادت کا انحصار زمانے کی مساعدت پر تھا۔ کئی گھنٹوں کی فکر و غور میں اُس نے آدھے دن کی قربانی کر کے منین سے ملنا اور بخت آزمائی کرنا طے کیا۔

دوسرے روز علی الصبح بیدار ہُوا غسل کیا۔ صاف کپڑے پہن کر نمازِ فجر ادا کی۔ اور مکان سے نکل کر منین کے دولتکدہ پر حاضر ہوا۔ دربان سے اطلاع کرائی۔ جب تک اذنِ حضوری آئے امید و بیم میں بسر ہوئی۔ کہنے کو تو چند لمحوں سے زیادہ وقفہ نہ تھا مگر اشرف کی نگاہ میں طولانی مدت تھی جسے کاٹنا دشوار ہو گیا! تھوڑی دیر میں طلبی کا حکم آیا۔ زردی پوش خادم نے اسے اپنے ہمراہ آراستہ و پیراستہ اقفس سدم میں ایک سنجیدہ جوان کے سامنے لا کھڑا کیا۔

یہی منین تھا۔ اس کی صورت سے وجاہت نمایاں تھی۔ پتلے پتلے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ اگرچہ جبین مصفا پر کوئی شکن نہ تھی تاہم بشرے سے فکر و غور کے آثار ہویدا تھے۔ اس نے رحم آلود نظروں سے اشرف کو دیکھا —— اور دیر تک دیکھتا رہا پھر نہایت شیریں لہجہ میں سوال کیا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

اشرف نے اخبار کا ورق پیش کرتے ہوئے عرض کی —— اس اعلان کو دیکھ کر حاضر ہُوا ہوں میں اس شہر میں اجنبی ہوں اس لئے خدا کے سوا کوئی سفارشی

ہے نہ ضامن۔

منین۔ مجھے ساری دنیا میں تمہارے ضامن کے سوا کوئی بھروسہ کے قابل نظر نہیں آتا۔ واقعی مجھے ایک ایسے متدین اور قابل نوجوان کی ضرورت ہے۔ جو میری عدم موجودگی میں کاروبار کو فروغ دے سکے۔ اس کی حیثیت خادم کی سی نہ ہوگی۔ بلکہ مالکانہ اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس کو تنخواہ کبھی نہ دی جائے گی۔ وہ بیٹے کے برابر کا حصہ دار سمجھا جائے گا۔ لیکن دو شرطیں قبول کرنے کے بعد آپ سے یہ خدمتیں سپرد کی جائیں گی۔

اشرف۔ وہ شرطیں کیا ہیں؟

منین۔ اولاً ایمانداری اور دیانت کا حلف کرنا ہوگا۔ دوسری شرط میرا حکم ماننا ہے جو ابھی بتایا نہیں جا سکتا۔ وقت آنے پر حکم دیا جائے گا اور اس کی تعمیل میں تمہیں رمضے پس و پیش کا حق حاصل نہ ہوگا۔ تم ایک شریف نوجوان ہو۔ پڑھے لکھے بھی ہو۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری کا کام صرف تمہارے نہ اپنی افسر اپر سپرد کرنے کو تیار ہوں۔ تم کو غور کرنے کے لئے ایک روز کا وقت دیتا ہوں۔ اگر یہ دونوں شرطیں منظور ہوں تو کل صبح سے آکر کام شروع کر دو۔ یہ آفس تمہارا آفس اور یہ کوٹھی تمہاری قیام گاہ ہو جائے گی۔ شاید ان ہنسی شرط منظور نہ ہو۔ تو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے اطمینان کو اتنا اور کہے دیتا ہوں کہ کوئی شریف النفس انسان کسی شریف الخیال انسان سے ایسی خدمت لینا جائز نہیں

رکھ سکتا ہے آئینِ شرافت نے قابلِ ترک کر دیا ہو ——— خدا حافظ! کل ملاقات ہو گی۔

(۵)

دنیا کی گنتی میں کئی سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ جہانِ تناسب میں صدہا انقلابات رونما ہو کر زمانے کی تاریخ کے سادے اوراق کو رنگین کر چکے ہیں۔ اشرف کی زندگی میں عظیم تغیر و تبدل واقع ہو چکا ہے۔

اب اشرف، وہ اشرف نہیں جو چند روز پہلے بمبئی کے بارونق بازاروں میں چیتھڑے لگائے معیشت کی جستجو میں سرگرداں نظر آتا تھا۔ اب زمانے کی سازگاری اور ایام کی مساعدت نے قعرِ تنزل سے اٹھا کر شہرت کے بام پر جلوہ فگن کر رکھا ہے۔ اس کی ترقی کا ولولہ عملی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کی لگاتار کوششوں، جان توڑ محنتوں نے کاروباری دنیا میں اسے ملک التجار کے مرتبے پر پہنچا دیا ہے۔ اس کا کاروبار اطرافِ عالم میں پھیلا ہوا ہے۔ یورپ کی بڑی بڑی کمپنیاں اشرف کے ذریعے سے اپنے کاروبارِ تجارت کو فروغ دینا چاہتی ہیں۔ اس کا آفس بمبئی کے مشہور ترین آفسوں میں ایک آفس ہے۔ یہ سب اس کی جفاکشی اور مشقت کا خوشگوار نتیجہ ہے۔

کیفیت یہ ہے کہ اس نے کامل غور و خوض کے بعد متین کی شرطیں منظور کر کے کام شروع کر دیا۔ دو ہفتے متین اس کے ساتھ رہا۔ جب ضروری امور سمجھا چکا تو وطن واپس آ گیا۔

متین کی غیر حاضری میں اشرف نے کمال دیانت اور بڑی محنت سے کام

شروع کیا۔ اُس نے تمام تر کوشش اپنی تجارت کو کامیاب بنانے میں صرف کر دی۔ اور بڑی حد تک مقصد بھی حاصل کر لیا۔ اسی سلسلے میں چند تجربے کار تاجروں سے شناسائی پیدا ہو گئی۔ اشرف کا خلقی اخلاق کام کر گیا۔ جو ایک دفعہ اس سے متعارف ہوا ہمیشہ کے لئے خیر خواہ بن گیا۔

انہیں آزمودہ کار تاجروں کے مشورے سے اُس نے جدید کاموں کا اضافہ کیا۔ اور چند سال کے الٹ پھیر میں اتنی دولت پیدا کر لی کہ اپنے حصے کی آمدنی سے کھوئی ہوئی ساری جائداد واپس لینے کے قابل ہو گیا۔ اب اس کے دل میں ایک آرزو پیدا کرنے لگی۔ وہ اپنی موروثی جائداد واپس لینے کا متمنی تھا۔ وہ رانوں کو جاگ جاگ کر غور و فکر میں مشغول رہتا تھا۔ اس نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح ممکن ہو گا ایک مہینے کی فرصت نکال کر وطن جاؤں گا اور جو لوگ میری موروثی جائداد پر قابض ہیں انہیں لالچ دے کر واپس لینے کی سعی کروں گا۔

اُس نے اپنے عزائم سے "متین" کو بھی مطلع کیا۔ اطلاع کے ساتھ ہی یہ خواہش بھی پیش کی کہ وہ کم سے کم ایک مہینے کے واسطے بمبئی آ کر کاروبار سنبھال لے۔ اور اس درمیان میں مَیں وطن جا کر کھوئی ہوئی جائداد واپس لینے کا موقع مل سکے۔

"متین" نے ہمیشہ اس قسم کی تحریروں کا گول مول جواب دیا۔ جب اشرف نے آنے کا قصد ظاہر کیا۔ تو اُس نے فوراً ٹیلی گرام بھیج کر روک دیا۔ کبھی کوئی خاص ضرورت نکل آنے سے وطن کی واپسی موقوف رہی۔ اس طرح ایک برس اور گذر گیا۔

ایک دن اشرف آفس روم میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ تجارتی معاملات پیش تھے۔ دلالوں اور خریداروں سے بات چیت چھڑی ہوئی تھی کہ ٹیلیگراف آفس کا چپراسی تار لے کر حاضر ہوا۔ اشرف نے رسید پر دستخط کر کے واپس کرتے ہوئے تار کھول کر پڑھا۔ نتین نے اسے فوراً طلب کیا تھا۔ دلی مراد بر آئی مینیجوں کو ضروری ہدایات دے کر کام سپرد کیا اور سامان سفر درست کر کے دوسرے دن وطن کی طرف مراجعت کی۔

(۶)

سالہاسال گزرنے کے بعد اشرف اس طرح وطن میں داخل ہوا۔ جیسے غیر ملکی سیاح سیر کرنے آتے ہیں۔ اس نے شہر کو استعجاب آمیز نظروں سے دیکھا کیونکہ بانسان میں غیر معمولی تغیر و تبدل ہو گیا تھا۔ قدیم زمانے کی فلک شکوہ عمارتیں زمین بوس ہو چکی تھیں۔ چوڑی چوڑی کشادہ سڑکیں نکل آئی تھیں۔ اور سان کے دونوں جانب جدید الوضع مکانات اپنے شباب کی کیفیت سے آئندہ روند کو وقف حیرت کرتے تھے۔ اسباب تجارت سے سجی ہوئی دوکانیں شوقینوں کی توجہ منعطف کر رہی تھیں۔ کاروال تاجر سوداگری میں مصروف تھے۔

اشرف نے ایک ہفتے کی جد و جہد کے بعد معلوم کر لیا کہ بالفعل جن لوگوں کے ہاتھ میں اس کی موروثی جائداد ہے۔ ان کو طمع زر دے کر واپس لینا محال نہیں۔ تو دشوار تر ضرور ہے۔ آٹھ روز کے تلخ تجربے نے اسے مایوس سا کر دیا۔ اور ایک دن اس نے اپنے بہت بڑے محسن متین سے ساری روداد بیان کر کے اپنا اندرونی

ملال ظاہر کیا۔ متین نے کان دھر کر تمام گفتگو سنی۔ کچھ دیر غور کرتا رہا۔ پھر سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

"اشرف! میں نے تمہاری اس دلی تمنا کو کامیاب بنانے کے لئے درپردہ بہت کوشش کی۔ ارادہ تھا کہ تمہارے ورثہ سے پہلے ہی کل جائداد تمہارے نام سے خرید لوں لیکن افسوس کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ مجھے اس سعی میں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ البتہ کامیابی کی ایک صورت پیدا ہوئی تھی۔ معلوم تم اسے پسند کر سکتے ہو یا نہیں؟"

اشرف۔ میرے محسن! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں موروثی جائداد حاصل کرنے میں ایک کے سوا ہر طرح کی قربانی کر سکتا ہوں۔

متین۔ میرا گمان ہے کہ تم جس چیز کو مستثنےٰ کرتے ہو۔ صاحب جائداد اسی چیز کا طلب گار ہے۔

اشرف۔ یعنی؟

متین۔ وہ جائداد ایک نا کتخدا خاتون کی ملکیت ہو چکی ہے۔ اور وہ خاتون تمہاری خوبیوں کو سن سن کر تمہاری خواستگار ہے۔ اُس کے والدین زندہ نہیں ہیں۔ وہ اپنی بے انتہا دولت و جائداد کی تنہا مالک ہے اور صرف اسی شرط پر تمام جائداد دینے کو تیار ہے کہ تم اُسے اپنا شریک زندگی بنا لو۔

اشرف کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ انتہا کا ضابط تھا۔ اس کے چہرے سے شادی

وغم مسرت و غضب کے آثار شاذ ہی شاذ ظاہر ہو سکتے تھے۔ خدا جانے ان لفظوں میں کون سا اثر مخفی تھا کہ وہ بیتاب ہو گیا۔ عالمِ بے اختیاری میں اُس کی زبان پہ جاری ہو گیا۔

ہرگز نہیں۔ اس شرط کو قبول کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ میں نے جس رشتے کو اخلاص کی زنجیروں میں جکڑ نے کے بعد توڑا ہے۔ اس کے سوا کسی رشتے کو پسند نہیں کر سکتا۔ میں اسی کی یاد میں جیتا ہوں اور اسی کی آرزو میں فنا ہو جاؤں گا۔

متین۔ لیکن میری وہ شرط کہ جو حکم دوں گا تمہیں ماننا پڑے گا یاد ہے یا نہیں؟ آج میں اسی شرط کی تعمیل چاہتا ہوں۔

اشرف کے منہ سے دردناک چیخ نکلی اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔

(۷)

اشرف کے ضمیر کے خلاف اُس کے عقد کا انتظام شروع ہو گیا۔ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ شادی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ یا اُس کی موت کو زبردستی دعوت دی جا رہی ہے۔ اُسے بڑی حیرت تھی کہ وہی متین جو اب سے پہلے اُس پر بے انتہا مہربان تھا جو کبھی کسی امر میں اُسے مرضی کے خلاف چلانے کا روادار نہ ہوتا تھا آج کیسا بدل گیا ہے جو اُس کے اشک خونیں دیکھ کر بھی نہیں پگھلتا! صریحاً اُس کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے مغموم کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اُس نے آکثر موقعوں پہ بے حد منت سماجت کی، عاجزانہ التجاؤں سے رحم پہ مائل کرنا چاہا لیکن متین کا ارادہ اٹل تھا۔ اُس نے

بجائے خود جھٹلے کیا تھا بختی سے اُسی عزم پر جما ہُوا تھا۔

رفتہ رفتہ شادی کی گھڑی قریب آگئی۔ وہ صبح جو اُس کی زندگی میں عظیم انقلاب نمایاں کرنے والی تھی۔ پردہ شب کو چیر کر اُفق گردوں پر ظاہر ہوئی۔ مُرغِ زرین بال نے سماپردہ مشرق سے سر نکالا۔ اُدھر اشرف کی تمناؤں کا آفتاب مایوسیوں کی گھٹا ٹوپ میں گم ہوگیا جس طرح پھانسی کے تختے کی طرف بڑھنے والا مجرم پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے۔ وہ بھی رحم کی التجا لے کر متلین کی نشستگاہ میں داخل ہوا لیکن حسرت و یاس اور ناکامی اس کا حصہ تھی، وہی حاصل ہوئی۔ متین نے اپنا ارادہ فسخ کرنا منظور نہ کیا۔

دن ڈھلا، شام ہوئی، مہمان آئے۔ ان کی تہنیت اشرف کے لیے ایسی تعزیت تھی جس کا تحمل آسان نہ تھا لیکن مشکلیں جلد سے گزرنے کے بعد آسانی سے بدل جاتی ہیں دل میں بے حسی پیدا ہو کر خود فراموشی کا عالم طاری کر دیتی ہے۔ یہی حال اشرف کا تھا۔ زندہ مردہ بدست زندہ کا مصداق تھا۔ بلکہ چلتا پھرتا ہُوا مردہ تھا۔ یا ایسی مشین تھا جو دوسروں کے ایما پر مرضی پر کام کرتی ہے۔ مولویوں نے اپنا پاک فرض ادا کر لیا۔ اُس کی زندگی تباہ ہوگئی اور رفتہ رفتہ حجرۂ عروسی یار ماؤں اور آرزوؤں کے مدفن تک پہنچانے کا انصرام شروع ہوا۔ وہ بے خود بنا بے حس تھا۔ جہاں بازو تھام کر لے جایا گیا بے عذر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں اُسے ایک مجسمۂ حسن و پیکرِ ناز نظر آیا۔ لیکن اس نے التفات نہ کی۔

زمین میں نگاہیں گاڑے بیٹھا رہا۔ اس کی مغمومیت و محزومیت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

یکایک پیکرِ حسن و لطافت کو حرکت ہوئی۔ بحرِ نور میں جزر و مد پیدا ہوا اور وہ بڑھ بڑھ کر اشرف کے قریب آ گئیں۔ وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اس کے لبوں پر مہرِ سکوت لگی تھی۔ چند لمحوں کے بعد در و دیوار سے نغمہ پیدا ہوا۔ ایک دلکش و نرم ریز آواز نے فضا کو مرتعش کر دیا۔ ہر چند اشرف پر بےخودی چھائی تھی لیکن ہوا نے یہ الفاظ گوش گذار کر ہی دیئے۔

"کیا اس قصوروار کنیز کی نذر قبول نہ ہو گی؟"

اشرف نے نظر اٹھائی۔ مگر اس نگاہ میں نفرت نہ تھی، حقارت نہ تھی، بلکہ حزن و رحم کے مخلوط جذبات کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ حنا آلود ہاتھوں میں چند کاغذات ہیں اور وہ آگے کی طرف بڑھے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

عروس:- آپ کی موروثی جائداد کا بیعنامہ۔

اشرف۔ خاتون! افسوس! اب میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کے واسطے اپنی استطاعت سے زیادہ قربانی کرنے پر مجبور کیا گیا ہے اور شاید یہ شدت تمہارے اشارے سے ہوئی ہے۔

عروس: میرے سرتاج! میں اپنے قصور کا اعتراف کرتی ہوں لیکن غور تو فرمایئے۔ بھلا میں اس مبارک رشتے کا قطع ہونا کیسے گوارا کر سکتی تھی جو ہمارے

والدین کے ہاتھوں قائم ہوا تھا اور جسے آپ نے محض جوشِ حمیت اور جذبۂ شرافت سے توڑ دیا تھا لیکن میں نے بھائی تحسین کے ذریعہ سے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے آپ کو وطن بلوا کر از سرِ نو اس کو قائم کیا۔

"تو کیا تم وہی ہو؟" اشرف نے عجیب اضطراب انگیز لہجے میں پوچھا۔ پیکرِ حسن نے کمال سنجیدگی سے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ہاں میرے سرتاج! میں وہی آپ کی کنیز جمیلہ ہوں۔"

نہ معلوم اس جواب میں کیا افسونِ پنہاں تھا کہ اشرف بے تابانہ اُٹھ کر اُس کے قدموں پر جھک گیا۔ غیر ارادی طور پر اُس کے منہ سے نکل رہا تھا۔

"معاف کرو جمیلہ! مجھے معاف کرو میں نے تمہیں روحانی اذیتوں میں مبتلا کیا۔ تمہارے مقدس جذبات و حسیات کا احترام نہ کرتے ہوئے رسوا کیا میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ مجرم ہوں۔ مجھے سزا دو۔"

جواب میں دو نازک حنا آلود ہاتھوں نے بڑھ کر ندامت سے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا۔ حسن و عشق مقابل ہوئے۔ دو قوی بازو دیکھتے دیکھتے حسن و عشق کی آغوش میں آیا اور ریحانہ کے لبوں پر پہلی مہر محبت ثبت کی گئی۔

دفعتہً اشرف چونک پڑا۔ برقی روشنی سے سارا کمرہ جگمگا رہا تھا۔ اخبار اسی طرح کھلا پڑا تھا۔ اس کے سامنے جمیلہ کھڑی ہوئی دلفریب ادا سے مسکرا رہی تھی اشرف اپنی خود رفتگی پر دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا ہوا اٹھا۔

جمیلہ (مسکراتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے۔ آج ہوا کھانے بھی نہیں گئے۔ شاید دن بھر اخبار بینی ہوتی رہی۔ چلئے باہر بھائی متین آپ کے منتظر ہیں۔

اشرف نے اپنے استغراق پر پردہ ڈالتے ہوئے سکوت اختیار کیا اور چپ چاپ جمیلہ کے ساتھ باہر چلا آیا۔

حُسنِ سعادت

جمیلہ بڑی سنجیدہ، دُور اندیش اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ صورت شکل میں ممتاز ہونے کے علاوہ خانگی امور کا بھی تجربہ بہت کافی تھا۔ والدین نے اُسے نسائی فنون کی بہترین تعلیم دلوائی تھی سنجیدگی اور بردباری کا یہ عالم تھا کہ صغر سنی ہی سے مستورات کے قلوب میں اقتدار قائم کر لیا تھا۔ اگرچہ ہنوز عمر کی سولھویں منزل میں گامزن تھی، جوانی کی ولولہ خیزیاں کیف آگیں بہاروں میں تبدیل ہو چکی تھیں تاہم متانت کا دامن ہاتھوں ہی میں تھا۔ اس زمانے کی نوخیال اکثر اعتدال کے جادے سے سرک جایا کرتی ہیں لیکن وہ اپنے جذبات پر قابو رکھتی تھی۔ والدین نے چھوٹی سی عمر میں خاندان کے ایک لڑکے سے بیاہ دیا تھا اور وہ سُسرال کی پابندیوں میں بچپنا بسر کر کے جوان ہوئی تھی، یہی اسباب تھے کہ وہ ہم سن لڑکیوں کے ساتھ

دوڑ دھوپ اچھیل کود میں شرکت کرنے سے معذور رہی ہیں کی مغلوب الغضب خوشدامن کی نکتہ چیں نگاہیں ہمیشہ اس کے افعال کی نگرانی میں مصروف رہیں۔ ساس کی جا اور بے جا روک ٹوک سے ہر چند اس کے طفلانہ جوش کو پیہم صدمات برداشت کرنا پڑے تاہم وہ خوش تھی کہ انہیں سخت گیریوں کی بدولت اُس کی ذات میں صبر و تحمل، حلم اور بردباشت کے بہترین اوصاف پیدا ہو گئے۔ جو امورِ نوخیز جمیلہ پر شاق تھے وہ تمام و کمال اُس کے لیے آسان ہو گئے اور شباب کا عنفوان شروع ہونے ہی اعلیٰ صفات کا مجموعہ بن گئی۔ بالخصوص خدا کی عبادت، شوہر کی رضا جوئی اور چھوٹے بڑوں کا احترام وہ نمایاں اوصاف تھے جن میں اُس کی زندگی مشکل سے مل سکتی تھی۔

یہ جوہر ایسا تھا جس نے اپنے اور پرائے دلوں میں گھر بنا لیا تھا۔ دیکھنے اور سننے والے مداح تھے۔ ایک جانب اس کا حلم اور بے زبانی سراہی جاتی تھی تو اُس کے مقابل میں ساس کی بدمزاجیوں پر تعجب اور نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ حیرت تو یہ ہے کہ اتنے جبر و تعدی کے باوجود کسی نے کبھی جمیلہ کی زبان سے شکایت کا ایک لفظ تک نہ سنا اور تو اور ہمدرد و ہمراز ہمجولیاں تک اُس کے غم و غصّے سے مطلع نہ ہو سکیں!

قبیصہ غیور، امرت اور خوبصورت واقع ہوا تھا۔ اُس نے کھیل کود میں طفلی کا

زمانہ رائگاں کرنے کے بدلے گراں بہا وقت علوم کی تحصیل اور مفید ہنر سیکھنے میں بسر کیا تھا۔ ابتدا ہی سے اس کی طبیعت کا میلان اُن اُمور کی طرف تھا جو بشر کو بشریت کی حدوں سے نکال کر فرشتہ بنا دیتے ہیں۔ اُس کی اعلیٰ ذہانت اور ذکاوت کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۴ برس کی عمر میں ہی رائج الوقت عربی اور فارسی سے فارغ ہو کر مغربی علوم کی طرف جھک پڑا۔ اس کے والدین خدا کے اس عطیے پر ہزار دل ہزار شکر کرتے تھے۔ اُس وقت اُن کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو جاتا تھا جب احباب کی زبانوں سے قیصر کی تعریف رُوحِ مسرت بن کے کانوں کے راستے دل و دماغ میں پہنچتی تھی۔ انہوں نے ہونہار فرزند کو تحصیلِ تعلیم کی طرف متوجہ دیکھ کر ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ اسی دوران میں جمیلہ کے ساتھ عقد پڑھوا کر لگے ہاتھوں اس فرض سے بھی سبکدوش ہو گئے۔

قیصر نے اپنے اوقات کو روزانہ کاموں پر تقسیم کر دیا تھا اور اس تقسیم کی پابندی ہر طور لازم تھی مثلاً وعلی الصباح جبکہ اندھیرا رہتا اسلامی فریضہ ادا کرتا، پھر تھوڑی ورزش کے بعد درسی کتابیں لے بیٹھتا۔ ۹ بجے کھانا کھا کر اسکول جاتا، وہاں سے فارغ ہو کر کسی باغیچہ کی سیر کرتا، چراغوں کے وقت احباب کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا اور پہر رات گئے کھانا کھا کر جمیلہ کی پاک اور معصوم باتوں سے روح کو تازہ کرتا یہ ایسا قطعی اور اٹل اصول تھا جس میں کبھی خلل نہ آتا تھا۔

اب قیصر کا سن ۱۸ سال کا ہو چکا تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد کالج

سے الیف، اے کی ڈگری بھی حاصل کر چکا تھا اور بی۔ اے پاس کرنے کا شوق علیگڑھ کی یونیورسٹی کی طرف لگائے تھا۔ اگرچہ والدین پردیس کی سکونت کے مخالف تھے اور مصر تھے کہ وہ مقامی کالج سے امتحان دے لیکن اُس نے منطقی دلائل پیش کر کے ان کی رضامندی حاصل کر لی تھی۔ رکاوٹ صرف اتنی تھی کہ ہنوز جمیلہ کی رائے کا اظہار نہیں ہو سکا تھا اور قیصر اُس کا مفید مشورہ لیے بغیر کوئی کام کرنے کا عادی نہ تھا۔

ایک روز قیصر احباب کو رخصت کر کے اندر آیا تو معمول کے خلاف جمیلہ کو خانگی کاموں میں مصروف پایا۔ وہ کپڑے اتار کر لیمپ کی روشنی میں ایک اخلاقی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ مولف نے کمال عرق ریزی اور جگر کاوی کے ساتھ گزشتہ اور موجودہ مشاہیر کے بہترین مقالات جمع کر دیئے تھے۔ اگر کوئی ہوشمند ان مشعلوں کی رہنمائی قبول کرے تو کوئی شبہ نہیں کہ حیات کی تاریک اور کٹھن منزلیں آسانی سے طے کر سکتا ہے۔ مگر اسے کیا کیا جائے کہ انسانی طبیعتیں ہی غلط پذیر واقع ہوئی ہیں!

جمیلہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں داخل ہوئی تو قیصر کو مطالعہ میں مشغول پایا۔ اُس نے مصروفیت کی وجہ سے کمرے میں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُمید کے خلاف وہاں موجود پا کر پوچھا۔ "آج قاعدے کے خلاف دیر تک کہاں رہے؟"

قیصر "میں تو ٹھیک اپنے وقت سے آ گیا تھا۔ البتہ تم خلاف معمول دیر تک کاموں میں لگی رہیں! کیا کوئی نیا شگوفہ تو نہیں کھلا؟"

جمیلہ۔ تم ان باتوں پر توجہ نہ کیا کرو۔ امّی جان ہماری بزرگ اور گھر کی مالکہ ہیں اُن کی تنبیہہ عزت اور فائدے سے خالی نہیں۔ یہ خیال بے شک تکلیف دیتا ہے۔ کہ غصہ کرنے سے اُن کے دشمنوں کو صدمہ پہنچتا ہو گا۔

قیصر۔ شاباش ہے تمہاری ہمت اور تحمّل پر۔ مجھ سے تو خواہ مخواہ کی خفگی برداشت نہیں ہو سکتی۔ بار بار جواب دینے کا ارادہ کرتا ہوں۔ لیکن اُن کے ادب اور تعلق زبان پکڑ لیتے ہیں۔

جمیلہ (دانتوں کے نیچے انگلی دبا کر) بری بات بزرگوں کو جواب دینا سعادت مندی کے خلاف ہے۔ اچھا ہوا کہ تم چپ رہے کچھ بول اٹھتے تو میرا دل کھٹا ہو جاتا۔

قیصر ندامت سے، واقعی میں نے بہت برا کیا جو ایسا قصد کیا۔ مگر انسان بھول چوک سے خالی نہیں۔ سنتے سنتے ضبط نہ ہو سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کا مرتکب نہیں ہوا۔ اب وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی ایسا ارادہ نہیں کروں گا۔

قیصر کو شرمندہ دیکھ کر جمیلہ نے گفتگو کا عنوان بدلتے ہوئے کہا۔ ابھی تک تمہیں بھوک نہیں معلوم ہوتی؟ نو بج چکے ہیں آخر سبق کب یاد کیا جائے گا۔

قیصر۔ اشتہا تو دیر سے معلوم ہو رہی ہے تمہاری باتوں میں کہہ نہیں سکا۔

جمیلہ نے ماما کو آواز دے کر کھانا لانے کا حکم دیا۔ چند پل میں دستر خوان چُن دیا گیا۔ میاں بیوی نے زندگی کے اس لازمے سے فراغت کی اور کتابیں کھول کر لیمپ کے سامنے جا بیٹھے۔ دو گھنٹے تک مطالعہ ہوتا رہا اُدھر گھڑیال نے گیارہ

بجائے ادھر دونوں نے کتابیں گردان کے بستر سے آباد کئے۔

بڑی دیر تک دونوں نیند کے انتظار میں مسک مارے پڑے رہے لیکن نیند کالے کوسوں تھی، فضا میں شب بے دار چوکیداروں کی بھیانک آوازیں" جاگتے رہو" کھنکھارتے رہو" ارتعاش پیدا کرنے لگیں۔ قیصر نے پلنگ پر پڑے پڑے علی گڑھ جانے کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ آج بھی وہ جمیلہ سے مشورہ کرنا بھول گیا تھا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اس کے پلنگ کی طرف دیکھا، معلوم کیا بات تھی کہ آج اس کی آنکھ بھی نہیں لگی تھی، چپ چاپ پڑی کروٹیں بدل رہی تھی، کلبلانے سے قیصر کو اس کے جاگنے کا گمان ہوا۔ اس نے تیقّن حاصل کرنے کو آہستہ سے پوچھا۔

"کیا آرام کر رہی ہو؟"

جمیلہ نہیں تو آج نیند اچاٹ ہو گئی ہے، بہیتر ا تن تن کے لیٹتی ہوں مگر وہ آنے کا نام نہیں لیتی۔

قیصر۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ گیارہ بجے سے آنکھیں بند کئے پڑا ہوں، نیند تو ایک طرف جھپکی بھی نہیں آئی! لیٹے لیٹے دم الٹنے لگا۔

جمیلہ۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا ہے۔ ایک تو نیند نہ آنے کی الجھن اس پر پچھلی رات کا سناٹا دل نہ گھبرائے تو کیا ہو، کچھ باتیں کرو طبیعت بہل جائے گی۔

قیصر۔ کئی روز سے ایک خاص مقصد میں رائے لینا چاہتا ہوں لیکن اب

اب تک مشورہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

جمیلہ۔ کہو اس سے بہتر کون محل ہو سکتا ہے؟

قیصر۔ میرا ارادہ ہے کہ وکالت پڑھوں یہ آزادانہ منفعت بخش پیشہ ہے۔

جمیلہ۔ بہت مبارک عزم ہے۔

قیصر۔ لیکن وکالت پڑھنے سے پہلے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنا ضروری ہے۔

جمیلہ۔ تو کیا مضائقہ ہے۔

قیصر۔ تمہاری مفارقت کا خیال ہے۔

جمیلہ۔ کیا شہر سے باہر جانا ہوگا؟

قیصر۔ ہاں علی گڑھ یونیورسٹی سے امتحان دینا چاہتا ہوں۔

جمیلہ۔ ہر چند تمہاری غیر موجودگی پریشانی کا سبب ہوگی مگر میں روشن مستقبل کی امید میں پورے استقلال اور صبر و سکون سے درمیانی زمانہ بسر کروں گی۔ تم بھی خط کے ذریعہ چوتھے دن تسلّی دیتے رہنا۔

قیصر۔ یہ جدائی بے حد شاق ہے۔ لیکن دنیا میں کچھ نہ کرنا بھی مجازی موت ہے۔ زندگی کا ثبوت صرف عملی جد و جہد سے دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ والدین سے اجازت حاصل کر لی ہے، تمہاری صلاح باقی تھی، اس وقت اُس سے بھی فراغ حاصل ہو گیا۔ یونیورسٹی کے کھلنے میں زیادہ وقفہ نہیں ہے۔ خدا نے چاہا تو ہفتے کے اندر ہی روانہ ہو جاؤں گا۔ جتنے دنوں بورڈنگ میں قیام رہے گا

سُولی پر جان رہے گی! میری موجودگی ہی میں اماں جان کیا کچھ بدمزاجی نہیں کرتیں۔ میرے جانے کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کیسی قیامت ڈھائیں؟

جمیلہ۔ تم ان باتوں کا سوچ نہ کرو۔ جیسا کچھ ہوگا میں خندہ روئی سے سہہ لوں گی۔

قیصر سفر کا ضروری سامان مہیا کر کے انوار کی شام کو علی گڑھ روانہ ہو گیا۔ رخصت کے وقت جمیلہ کو میٹھی نظر سے دیکھ کر "خدا حافظ" کہا۔ جو شربت حیات بن کر کانوں کی راہ سے دل میں اتر گیا۔ مفارقت کے صدمے سے شربتی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے لیکن بدشگونی کے خوف نے نکلنے نہ دیئے۔ اس احوال سے قیصر بھی بے خبر نہیں رہا۔ مردانہ قوت سے کام لیتے ہوئے حزنیہ جذبے کو ضبط کیا اور دکھانے کے لئے مصنوعی تبسم کے ساتھ وداع ہو گیا۔ جمیلہ بے محل مسکراہٹ سے دھوکے میں مبتلا ہو گئی۔ تاہم دل کے آئینے پر کدورت کا زنگ نہیں چڑھنے دیا۔

قیصر کی غیر حاضری میں جمیلہ نے اپنی ساری ہی کوشش غصہ ور ساس کو راضی رکھنے میں صرف کرنا شروع کی۔ علی الصبح نماز اور قرآن مجید کی تلاوت سے فارغ ہو کر گھر کے انتظامات میں مشغول ہو جاتی۔ باورچی خانے کا تمام کام اپنی نگرانی میں انجام دیتی۔ پہر دن چڑھے ساس سسرے کو کھلا کر خود کھاتی۔ دوپہر کو اس کی ساس تمباکو کرنے بیٹھتی تو اس کے پاس جا بیٹھتی اور ادھر ادھر کی باتوں سے سر کھپاتی۔ شام کو پھر بوستو بہلانے، پڑھنے کے فرائض انجام دیتی۔ دس بجے رات کے بعد فارغ ہو

کہ آرام کرنے لیٹتی تو نیند اچاٹ ہو جاتی قیصر کی خیالی تصویر سامنے آکر اُس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی اور وہ شوہر کی یاد میں اُس وقت تک پہلو بدلا کرتی۔ جب تک پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا آنکھوں میں گھُس گھُس کر غافل نہ کر دیتی۔

اسی طرح دو ہفتے گذر گئے۔ اس درمیان میں خورشید بیگم کو غیظ و غضب کے بخارات نکالنے کا موقع نہیں ملا تاہم عادت کے مطابق دن میں دو چار جھڑکیاں دے دیا کرتی۔ لیکن جمیلہ عاجزانہ طور پر "قصور ہوا" کہہ کر معافی مانگ لیتی۔ اس تدبیر سے بات جہاں کی تہاں دب جاتی، خصوصاً ملازمین پر جب کوئی آفت نازل ہوتی تو وہ ان کے جملہ الزامات کی ذمہ دار بن جاتی اور جس قدر مصائب کا سامنا ہوتا انہیں خندہ روئی سے برداشت کر لیتی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ جمیلہ کی ایک ہمجولی بہت زمانے کے بعد ملنے آئی۔ جمیلہ اس کی خاطر مدارات میں مشغول ہونے کی وجہ سے باورچی خانے نہ جا سکی۔ اتفاقاً اسی روز ماما کی غلطی سے سالن میں نمک تیز ہو گیا! جب دسترخوان چُنا گیا تو کسی نے کچھ نہ کہا مگر ساس نے حشر برپا کر دیا۔ سالن کا پیالہ انگنائی میں پھینک دیا ماما کے عوض جمیلہ پر برس پڑی۔ ایک زبان میں سینکڑوں صلواتیں سنا کر رکھ دیں، آفرین ہے اس کے دل گردے پر کہ منہ سے اُف تک نہیں کی۔ سر جھکا کے سب کچھ سن لیا اور جب وہ خاموش ہوئی تو بڑی منت سے ہاتھ جوڑ کر خطا کی معافی چاہی لیکن پتھر میں جونک لگ سکتی تو ساس کا دل بھی

پسیجتا۔ جمیلہ کی عاجزی نے اور بھی چراغ پا کر دیا اور اس نے پھر بے نقط سنانا شروع کیں:

قیصر کے والد افسر حسین اب تک تو اس خیال سے خاموش رہے کہ جمیلہ کا حلم قضیئے کو رفع دفع کر دے گا لیکن بیوی کا جابرانہ رویہ دیکھ کر نہ رہا گیا اور بول اٹھے "آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ برابر غصہ کئے چلی جاتی ہو۔ جمیلہ کا قصور ہوتا تو یوں بھی سہی وہ غریب تو بے قصوری پر ہاتھ جوڑ رہی ہے۔ تم کو چاہیئے ہے کہ بہو کو کلیجے سے لگاؤ نہ کہ الٹے اپنی ملامتوں کا نشانہ بناؤ۔"

افسر حسین کی ہمدردی نے اسے اور بھی تعل در آتش کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میاں بیوی میں خوب جھوڑ ہوئی۔ جمیلہ نے بہتیرا کوشش کی کہ ساس سسرے میں تو تو میں میں نہ ہو مگر اس کی سعی بار آور نہ ہو سکی۔ انجام کار بیوی کی بد دماغی سے جز بز ہو کر افسر حسین نے بہو کو اس کے میکے سوار کرنا چاہا۔ جمیلہ نے گھر جانے سے حیلے حوالے کئے تاہم سسرے کا حکم اٹل تھا وہ زار زار روتی ہوئی میانے میں بیٹھ کر میکے روانہ ہو گئی۔

جمیلہ کے جاتے ہی اس کی غیظ پرور ساس نے پہلی فرصت میں قیصر کے نام ایک خط ترقیم کیا اور جہاں تک اس کی کینہ توز طبیعت تلاش کر سکی گھڑ گھڑ کے جمیلہ کے عیوب نمایاں کئے اور جس حد تک محاسن پر پردہ ڈالنے کا امکان ہوا۔ اس

سے کوتاہی نہیں کی۔ خط ختم کرنے کے بعد ہمراز ماما کی معرفت ڈاک میں چھوڑوا کر طمینان کی سانس لی۔

افسر حسین کو اس کارروائی کی خبر تک نہ ہوئی، وہ اس بھلاوے میں بھولے ہوئے تھے کہ خانگی جھگڑے ایک خاص وقت میں اٹھتے اور از خود ختم ہو جایا کرتے ہیں، جب بیوی کا غصّہ اترے گا تو خود ہی بہو کو بلالیں گی۔ لیکن بیوی کو یہ خلش بے چین کر رہی تھی کہ انہوں نے بہو کے مقابلے میں میرا خیال مطلق نہیں کیا، جمیلہ کی جنبہ داری کر کے میری بات ضائع کی، اور یہی خلش بہو سے انتقام لینے پر آمادہ کر رہی تھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس کی بالائی کارروائی بڑی حد تک کارگر ثابت ہوئی۔ علیگڑھ خط روانہ کرنے کے چوتھے روز افسر حسین کے نام قیصر کا خط موصول ہوا۔ اس خط میں اس نے جمیلہ کے طبعی انقلاب پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سرکشی اور ناسعادت مندی پر ملامت کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے میکے میں رکھے جانے کا مشورہ پیش کیا تھا۔

خط پڑھ کے افسر حسین کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسی طرح غصّے میں بھرے زنانے مکان میں آئے۔ ان کی قہری آمد نے بیوی کو سہما دیا۔ وہ مغرور المزاج ہونے کے باوجود میاں کو غضبناک دیکھ کر ڈر جاتی تھی۔ جب تک وہ مزاج کی برہمی کا سبب دریافت کرے، افسر حسین کھلا ہوا خط ہاتھ میں لیے صحن میں پہنچ گئے۔ اور بیوی کو کڑے تیوروں سے گھور کر خط دکھلاتے ہوئے پوچھا "کیوں جی!

قیصر کو کیا کیا لکھ بھیجا؟ کہ اُس نے مجھے ایسا خط بھیجا! لاکھ لاکھ سمجھایا کہ ان بے ہودہ حرکتوں سے باز آؤ مگر تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں، بڑھاپے میں شرمناک افعال سے نہیں شرماتیں۔ بھلا غریب جمیلہ نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کی سات پیڑھی کو پُن کے رکھ دیا؟ اس پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا تو پردیس میں لڑکے کا جگر برمانے کو خدا جانے کیا کچھ زہر اگلا؟"

شکیلہ بیگم نے آنچل سے آنسو پاک کر کے کہا "بلّی تانگھ کے آئے ہو جو ایسی باتیں کر رہے ہو؟ میری ساری عمر تمہارے ساتھ گذری مگر کبھی ایسی باتیں سننے میں نہیں آئیں، ذرا خدا لگتی بھی کہا کرو۔ یہ نہیں کہ ہلتینہ جمیلہ کی پاسداری کرتے رہو۔ اس چھوکری کو تو مجھ سے للّہی بغض ہو گیا ہے۔ کچھ نہیں تھا تو سالن میں نمک ہی جھونک دیا۔ میں نے زبان ہلائی تو تم خفا ہونے لگے۔ بھلا میں تین پانچ کی باتیں کیا جانوں؟ امامن کہاری نے چپکے سے بتایا کہ بہو صاحب نے مٹھی میں بھر مٹھی نمک جھونک دیا۔ تم سے داد نہ ملی تو مجبوراً قیصر کو لکھ بھیجا۔ یہ نہ کرتی تو کیا کرتی؟ خدا رکھے تم دونوں کے سوا میرا کون ہمدرد نہ ملیٹھا ہے؟"

افسر حسین۔ "بلاؤ تو نمک حرام امامن کو۔ ابھی قلعی کھلی جاتی ہے۔"

امامن نے جو افسر حسین کو یہ کہتے سنا تو جان نکل گئی! چپکے سے اخترہ بغل میں دبایا اور جان بچا کر گھر سے نکل گئی۔ میاں اپنے خیال میں اور بیوی اپنے یقین پر راسخ رہیں۔ انجام یہ ہوا کہ افسر حسین بگڑ کر علی گڈھ روانہ ہو گئے۔

چلتے وقت جمیلہ سے ملنے آئے تسلی کی باتیں کیں۔ اس نے سعادت مندانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے عرض کی کہ "آپ کیوں ہلکان ہوتے ہیں؟ اس قصے کو یہیں ختم کر دیجئے میری غلطی سے یہ مصیبت نازل ہوئی ہے۔ بس ہی جھیلوں گی بھی"۔

افسر حسین (سر پر ہاتھ پھیر کر، بیٹا) تم اپنا دل خفا نہ کرو۔ میں جو کام کرتا ہوں خوب سوچ سمجھ کے کرتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو اس کارروائی کے بعد تمہاری ساس بالکل سیدھی اور بے زبان ہو جائیں گی۔ بدمزاجی کا اصلی سبب یہ ہے کہ غلط نازبرداری کی گئی۔ ضرورت ہے کہ اس کا تدارک کیا جائے۔ امید ہے یہ سفر تیر بہدف ثابت ہوگا اور ان کے مزاج میں کافی تبدیلی ہو جائے گی۔

جمیلہ۔ آپ کی مصلحت جو کچھ بھی ہے بہت ہی مناسب ہے لیکن میں پھر التجا کروں گی کہ اس دفعہ سفر کی کارروائی ملتوی رکھی جائے۔ آئندہ کسی موقعے پر آپ کو اختیار ہے۔ اماں جان میری بزرگ ہیں۔ ان کی تنبیہیں بجا ہوں یا بے جا، میرے واسطے کسی حال میں فائدے سے خالی نہیں۔

افسر حسین نے جمیلہ کے مشورے کو قبول نہیں کیا۔ اپنی واپسی تک میکے میں رہنے کی تاکید کے ساتھ قیصر کے پاس علی گڑھ روانہ ہو گئے۔

قیصر کو علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوئے کئی ہفتے گزر گئے۔ اس درمیان میں اس نے ذہانت اور ذکاوت کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ ٹیچروں اور پروفیسروں

حیرت ہوگئی۔ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس کی ذہانت کا سکہ بیٹھا ہو۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی خوش مزاجی اور خوش اخلاقی کا آوازہ بھی کالج کی دیواروں میں گونج رہا تھا قلوب اس کی طرف جھکتے رہے تھے اور وہ ذاتی اوصاف کی بنا پر روز بروز ہر دل عزیز بن رہا تھا۔ اس کا سارا دن پڑھنے لکھنے میں اور شام کھیل تفریح یا احباب کی صحبت میں بسر ہو جاتی تھی۔ مگر رات کو آرام کرنے لیٹتا تھا تو گھر کا پیارا خیال اور جمیلہ کی معصوم یاد آنکھوں کی نیند اچاٹ کر دیتی تھی۔ ماں کی آتش مزاجی کا خوف دل میں لرزہ ڈال دیتا تھا۔ اگرچہ جمیلہ کا حلم جھگڑا فساد نہ ہونے کا ضامن تھا پھر بھی آگ پانی کا ساتھ خطرے سے خالی متصور نہیں ہو سکتا۔

بہت جلد قیصر کے اندیشے کی تصدیق اس خط سے ہوگئی جو شکیلہ بیگم نے جمیلہ کی مخالفت میں ارسال کیا تھا۔ اس نے مادرانہ حقوق کی قسم دیتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ جتنا جلد ممکن ہو اس بلا کو میرے سر سے دفع کر دو۔ اس کے چلتے میرا جینا اور کھانا پینا دشوار ہو گیا ہے۔ خصوصاً تمہارے بابا جان نے جب سے اس کی پرچک لینا شروع کی ہے۔ اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ بڑا دیکھتی ہے نہ چھوٹا جو منہ میں آتا ہے بے تکلف کہہ گزرتی ہے۔

قیصر خط کے پاتے مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ ماں کا عتاب وہ عظیم مصیبت ہے کہ ٹالے نہیں ٹل سکتی۔ اور جمیلہ کی حلیمانہ خصلتوں سے امید نہیں کہ گستاخیوں کی مرتکب ہو۔ بے قصور پر رحم کے عوض جبر، نرمی کے بدلے سختی۔ کیسی ناانصافی ہے؟

بار بار قلم اٹھا کر تنبیہ کرنا چاہی مگر ہاتھ کی کپکپی نے ایک لفظ بھی نہ لکھنے دیا۔ والدہ کا تاکیدی حکم تعمیل کا خواہاں حق شناس ضمیر انصاف کا متقاضی۔ بڑی کشمکش کے بعد ماں کا فرمان فتحیاب ہوا اور اس نے افسر حسین کے نام وہ عریضہ مرقوم کیا جس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔

ڈاک سے خط اور قیصر کے دل سے قرار روانہ ہو گیا۔ ہر وقت بے چینیاں نرغے میں رکھنے لگیں۔ کوئی ساعت ایسی نہ تھی۔ جب مظلوم پر جبر کرنے کا اندوہناک خیال کانٹے کی طرح کھٹکتا ہوا محسوس نہ ہوتا ہو! آہ! جب جمیلہ کے کان میں خط کے نالائم الفاظ پڑیں گے تو اس کا معصوم دل کیا کہے گا؟ کئی دفعہ ارادہ ہوا کہ اپنے جی کی صحیح کیفیت چپکے سے لکھ کر معذرت کرے لیکن والدہ کا یہ جملہ کہ اگر اب بیوی سے خط وکتابت کی تو دودھ نہ بخشوں گی"عنان گیری کرتا رہا۔ ہر چند جمیلہ کے کئی خطوط موصول ہوئے تاہم اس کی سعادت مندانہ مجبوریوں نے جواب لکھنے کی جرأت سے قاصر رکھا۔ یہاں تک کہ اسی اٹھوارے میں افسر حسین بغیر اطلاع دیئے ہوئے وارد ہو گئے اور اس سے پہلے کہ قیصر کو ان کی آمد کا باعث معلوم ہوا انہوں نے اس نادانی پر لے دے شروع کر دی جو ماں کے خوش کرنے کو اختیار کی گئی تھی۔ ساتھ ساتھ حکم دیا کہ فی الفور جمیلہ کو تحریر بھیج کر مطمئن کر دو۔ اگر اس حکم کی بجا آوری میں تساہل برتا گیا تو حشر تک میرے دل سے خلش نہیں جائے گی۔

قیصر نئی طرح کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ والد اور والدہ کے حکم میں زمین اور

آسمان کا فرق تھا اور اس پر صدا کی جانب سے فریقین کی اطاعت فرض تھی۔ دیر تک غور کرنے کے بعد اٹھا اور ماں کا مرسلہ خط لا کے باپ کی خدمت میں پیش کر دیا افسر حسین نے ابتدا سے انتہا تک پڑھا ایک ایک جملے پر چہرہ سرخ ہو گیا۔ خط تمام کر کے قیصر سے کہا "تم اس خط کی وجہ سے خود لکھنا نہیں چاہتے۔ تو میں بھی اصرار نہیں کروں گا۔ بلکہ اس خدمت کو تمہارے عوض خود ہی انجام دوں گا۔"

یہ کہنے کے بعد قلم دوات اور کاغذ طلب کر کے جمیلہ کو خط مرقوم کیا اور تمام حالات کو تفصیل سے بیان کر کے قیصر کی مجبوریوں کو ظاہر کرتے ہوئے معذرت کی۔ آخر میں اسے بے فکر اور مطمئن رہنے کی ہدایت کر کے خط تمام کیا۔

جمیلہ نے میکے سے قیصر کو آٹھ دس خطوط لکھ کر اپنی بے قصوری کا یقین دلایا۔ لیکن علی گڑھ سے کسی خط کا جواب نہیں آیا! وہ تین خطوں تک تو یہ کہہ کر دل کو ڈھارس دیتی رہی کہ شاید میرے بھیجے ہوئے خطوط انہیں موصول نہیں ہوئے۔ یا لکھنے پڑھنے اور امتحان کی تیاریوں کی مصروفیت نے جواب تحریر کرنے کا موقعہ نہیں دیا ہوگا مگر جب خط پر خط لکھنے کے بعد بھی جواب موصول نہیں ہوا۔ تو ماتھا ٹھنکا اور یقین ہونے لگا کہ ساس کے ساتھ میاں بھی ناراض ہو گئے۔ یہ خیال نہ تھا ایک برچھی تھی جس سے دکھیا کا کلیجہ شق ہو گیا۔ وہ گھر والوں کی نظر بچا کر تنہائی میں روتی اور بہت روتی۔ جہاں تک اس کے فہم کی رسائی ممکن

تھی۔ اپنی تقصیر بحل کرانے کی تدبیر سوچی۔ سوچتے سوچتے کئی دن گزر گئے۔ مگر کوئی ایسی صورت ذہن میں نہ آئی جو مقصد پورا کر سکتی۔ بے جا غور و فکر نے ارغوانی رنگ کو زعفرانی بنا دیا۔ پھول سے رخسارے مرجھا گئے اور دیکھنے والوں کو اُس کی علالت کا اندیشہ پیدا ہونے لگا۔

اس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ سسرال جا کے روٹھی ہوئی ساس کو منانے کی کوشش کرے لیکن افسر حسین کے تاکیدی فرمان نے میکے سے قدم نکالنے کی اجازت نہیں دی۔ ایک روز تنہا بیٹھی ہوئی موجودہ دشواریوں کا حل سوچ رہی تھی۔ کہ ماما نے ایک لفافہ پیش کیا۔ اس پر علی گڑھ کی مہر دیکھ کے جی خوش ہو گیا لیکن غیر کے ہاتھ کی تحریر ہونے سے وہ خوشی غم سے بدل گئی اور بیزارانہ انداز سے لفافہ ایک طرف ڈال دیا گیا۔ چند منٹوں تک یاس کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر لفافہ اٹھایا۔ تیدک کھولی اور خط نکال کے پڑھنا شروع کیا۔ نگاہوں سے جوں جوں مضمون گزرتا جاتا تھا۔ چہرے میں بحالی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوتی جاتی تھی۔ خط تمام ہونے ہی یہ جملہ آہستگی سے اُس کے لبوں پہ آ گیا۔ "اخاہ! جواب نہ آنے کی یہ وجہ تھی۔ اب مجھے کوئی شکوہ نہیں۔" خوشی کے لمحے میں اسی وقت افسر حسین کو خط کے ذریعے سے اپنے مطمئن ہونے کی اطلاع بھیج دی۔

سارا دن دلی مسرت میں بسر ہوا۔ رات کو کھا پی کر آرام کرنے بیٹھی تھی کہ ایک ماما نے ہمائنہ بہو کے ساس کے بیمار ہونے کی خبر سنائی۔ اس کے بیان سے معلوم ہوا

کہ صبح تک مزاج بالکل ٹھیک تھا۔ شام کا جھٹپٹا پھیلتے ہی گردے میں درد کی چمکیں اٹھنے لگیں اور اب تو کسی کروٹ چین ہے نہ کسی پہل قرار، مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہیں۔ کئی نوکر چھپ چھپا کے بھاگ گئے۔ خدا رکھے چھوٹے اور بڑے سرکار جم ہی جم ہیں۔ اس وقت کوئی اتنا بھی نہیں ہے جو حکیم یا ڈاکٹر کے پاس دوڑ جائے۔ اطلاع ملتے ہی جمیلہ بدحواس ہوکر اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئی جو کچھ ماما سے سنا تھا من وعن بیان کرنے کے بعد عرض کی۔ "میں امّی جان کے پاس جاتی ہوں، آپ حکیم صاحب کو فوراً بھجوا دیجیے۔"

کہاروں نے میانہ لگا دیا۔ جمیلہ سوار ہوکر سسرال پہنچی تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ در و دیوار سے بے رونقی ظاہر جگہ جگہ کوڑا کرکٹ جمع۔ نہ اگلا سا سلیقہ نہ صفائی، جو چیز جہاں پڑی ہے، پڑی ہے! کوئی پوچھنے والا نہیں، ایک حجرے میں خوش دامن صاحبہ پلنگڑی پر پڑی درد کی شدت سے کراہ رہی ہیں۔ اگرچہ علالت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر صورت پہچانی نہیں جاتی، معلوم ہوتا ہے ہفتوں سے مرض نے دبا رکھا ہے! جمیلہ یہ حال دیکھ کر تاڑ گئی کہ محض درد ہی نے اس دیہاڑے کو نہیں پہنچایا ہے۔ افسر حسین کے ناراض ہوکر جانے کا روحانی ملال بھی اس میں شریک ہے۔ وہ آہستہ سے پٹی پر بیٹھ گئی اور آرام رساں طریقے سے دبانا شروع کیا۔

شکیلہ بیگم کو درد کی تکلیف سے اتنا ہوش نہ تھا کہ بہو کو پہچان سکتی،

جس ہیجان سے تڑپ رہی تھی۔ اسی طرح پہلو بدلتی اور کراہتی رہی۔ اتنے میں حکیم صاحب کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ جمیلہ کے والد نے پردہ کرایا۔ حکیم صاحب اندر تشریف لائے، مریضہ کی نبض دیکھی، حال پوچھا، نسخہ لکھا اور تشفی دے کر رخصت ہوئے۔

جمیلہ کے والد خود بازار گئے۔ عطار کی دکان کھلوا کر دوا لائے۔ جمیلہ نے انگیٹھی روشن کی، دوائیاں جوش کیں اور چھان بنا کر ساس کو پلائیں۔ رات بھی ورد تھا۔ حکیم صاحب کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے گھنٹہ بھر میں سکون ہو گیا اور شکیلہ بیگم نے نقیبہ آنکھیں کھول کر بیمار دار کو دیکھا لیکن کچھ مرض کی تکان اور کچھ جمیلہ کے جسمانی تغیر نے پہچاننے نہیں دیا۔ جمیلہ نے مزاج پوچھا تو آواز سے پہچانا اور اپنے گزشتہ سلوک کو یاد کر کے پشیمان ہو گئی!

یہ پہلا موقع تھا کہ شکیلہ بیگم کو جمیلہ کی اطاعت نے اپنے کئے سے خجل کیا اور اس نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں غلط روی اختیار کرنے پر لعنت ملامت شروع کی۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر آئندہ محتاط رہنے کا پختہ عہد کیا۔ قلبی تحریک نے طمانیت کی لہریں پیدا کیں اور وہ خاموشی کے ساتھ ان لہروں میں بہنے لگی۔

جمیلہ اس سکوت کو بے ہوشی سمجھ کے پریشان ہو گئی۔ منہ پھیر کر دیکھا تو حجرے میں اپنے سوا کسی کو نہ پایا۔ ساس کی بے مزاجیوں سے تنگ ہو کر ماہ صلیلیں

بھاگ بھاگ گئی تھیں اور ٹوٹی ماری ایک آدھ عورت رہ گئی تھی۔ تو وہ بھی ٹھٹکی ٹھٹکی تھی۔ کسی کو سامنے نہ پا کے خود اٹھی۔ الماری سے کیوڑے کی بوتل نکالی اور مریضہ کے منہ پر چھڑک کر پنکھے کی ہوا دینے لگی۔ اس خلوص نے شکیلہ بیگم کے اثر پذیر دل کو اور زیادہ متاثر کیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر بے اختیار دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ جمیلہ نے اشارہ سمجھا اور ساس کے سینے سے چمٹ کر زار زار رونے لگی۔

تھوڑی دیر تک دونوں اپنے اپنے دل کی بھڑاس آنسوؤں کے ذریعے سے نکالنے میں مصروف رہیں۔ جب سینے کا پتھر ہٹا اور دل کا بوجھ ہلکا پڑا تو شکیلہ بیگم نے کہا "بیٹی! میں نادم ہوں کہ میرے چلنوں تم کو بے شمار تکلیفیں اٹھانا پڑیں، دوسری لڑکی ہوتی تو ساری عمر منہ دیکھنا گوارا نہ کرتی۔ لیکن یہ تمہاری ہی معصومیت ہے۔ جو اب تک خلوص اور محبت کا برتاؤ جاری ہے! تمہاری نیکیوں نے میرے روئیں روئیں کو گراں بار کر دیا ہے۔ کیا تم میری گزری ہوئی بدسلوکیوں کو بھول کر مجھے تلافی کا موقعہ دے سکتی ہو؟

جمیلہ دست بستہ امی جان! آپ کیا فرماتی ہیں؟ کہیں بزرگوں کی تنبیہ سے خوردوں کا دل دکھ سکتا ہے؟ میری عزت اور سعادت تو اسی میں ہے کہ آپ کے قدموں میں پڑی رہوں۔ اللہ اور اللہ کا رسول بہتر جانتا ہے۔ کہ اتنے دنوں قدموں سے جدا رہ کر دل کا کیا حال ہوا؟ خدا کا شکر ہے کہ پھر آپ کے دامن کا سایہ نصیب ہو گیا۔

شکیلہ بیگم: بس بیٹی بس! مجھے زیادہ شرمندہ نہ کرو ——

جمیلہ (بات کاٹ کے) خدا خدا کر کے ابھی درد میں تخفیف ہوئی ہے۔ اب تھوڑا آرام کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن، ہی پھر تکلیف میں مبتلا ہو جائیں۔

شکیلہ بیگم نے سکوت اختیار کیا، جمیلہ آرام دہ عنوان سے چپی کرنے لگی۔ درد میں کمی اور راحت بہتر ہونے سے بہت جلد نیند آ گئی لیکن دماغ میں مختلف خیالات گشت کرتے رہے۔ دل میں بدسلوکیوں کی یاد کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ بار بار سوتے سے چونک پڑتی تھی، جمیلہ اس چونکنے کو درد کی چمک تصور کر کے ڈر جاتی تھی۔ اسی طرح آدھی رات گزر گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں خنکی محسوس ہونے لگی۔ پرسکون فضا اور خاموش ماحول پا کے نیند نے غلبہ کرنا چاہا۔ جمائیوں پر جمائیاں آنے لگیں۔ نیند کا حملہ رد کرنے کے لئے خاصدان سے گلوری نکال کے کھائی، پانی سے آنکھیں صاف کیں اور بدستور خدمت میں مشغول ہو گئی۔

شکیلہ بیگم بے خبر سو رہی تھی، بیماری کا اثر زائل ہو چکا تھا اور اس کی جگہ انفعال نے حاصل کر لی تھی۔ اسی عالم میں اس نے خواب دیکھا کہ "ایک لق و دق صحرا میں کھڑی ہے۔ چاروں جانب خار دار درختوں کی گنجان جھاڑیاں محیط ہیں۔ سطح فلک سے آفتاب کی جلالت ٹپک رہی ہے۔ تیز اور تند ہواؤں سے سائیں سائیں کرتا ہوا جنگل نار کا کرہ بن گیا ہے۔ خون آشام درندوں کے

خوف سے جسم کے اندر لرز رہی ہے۔ اس نے اضطرار کے عالم میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی، انسان تو انسان کہیں اُن کے پاؤں کا نشان بھی دکھائی نہیں پڑا۔ گھبرا کے قدم اٹھایا اور خدا کو یاد کرتی ہوئی ایک سمت چل نکلی بیابان کے تمازت پذیر ذرّوں نے چنگاریوں کی خاصیت اختیار کر لی تھی، نکیلے خشک کانٹے تلووں سے پار ہوئے جاتے تھے، تشنگی کی انتہا نہ تھی، مگر وہ ہمت باندھے تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ روا روی میں دن تمام ہو گیا، طیور چہچہا کر آشیانوں میں جا بیٹھے، شام کی روح پرور فضائیں بھی دشت کی ہولناکی میں آمیز ہو کر جاں ستاں ہو گئیں، جب بادیہ پیمائی سے شل ہو کر دم لینا چاہا تو اسی مقام پر تھی جہاں سے چلی تھی!

رات ہوئی، مصیبت کی ماری دکھیا پر خوف طاری ہو گیا، درندوں کی ہیبت صدائیں روح کو تحلیل کرنے لگیں، دن کی آتش ریز فضاؤں نے انتہائی برودت اختیار کر لی، برف میں بجھے ہوئے سرد جھونکے کلیجے سے پار ہونے لگے۔ سردی کی شدت سے دانت کٹکٹانے لگے، تاریکی بڑھ رہی تھی۔ وہ بیچاری ہر طرف چل پھر کر امن کی جگہ تلاش کرنے لگی، ایک مقام پر نیا در کا انبار نظر پڑا، جاڑے سے پناہ لینے کے لئے اس میں لمحہ بھر ٹک رہی، زہریلے کیڑوں کا ڈر خون خشک کئے دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی، سورج نے پھر اگلے دن کی کیفیت قبول کر لی آسمان سے آگ برسنے لگی! آج پھر اس نے سابق کی طرح سعی

نکلنے کی سعی کی۔ احتیاطاً سمت بدل کر دوسرا رُخ اختیار کیا۔ چلتے چلتے پاؤں متورم ہو گئے اور زبان سوکھ کر منہ سے باہر نکل پڑی۔ تمام بدن سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اس جنگل سے صحیح سلامت نکل جانا ممکن نہیں۔ ناامیدی نے ہمت پست کر دی، رفتار کی طاقت ساتھ چھوڑ گئی اور وہ بے ہوش ہو کے گر پڑی۔

خدا ہی کو علم ہے کہ کب تک غشی طاری رہی۔ جب ہوش ہوا تو پُرہیب جنگل کا وجود نہ تھا! اس کے بدلے اپنے آپ کو زمردیں فرش (سبزے) پر ایک بہار آفریں لالہ زار میں پایا۔ عجب تو یہ ہے کہ نہ پیاس سے زبان میں کانٹے پڑے تھے نہ پاؤں کے زخم اور ورم کا وجود تھا۔ فرحناک ہوا کے روح پرور جھونکے چل رہے تھے اور صبح صادق کا نورانی سماں تھا۔ تر و تازہ میووں کے درخت لہلہا رہے تھے اور پھلوں کے بوجھ سے ان کی ڈالیاں جھکی پڑتی تھیں۔

دو روز گزر چکے تھے کہ ایک کھیل بھی اڑ کر اُس کے منہ تک نہیں پہنچی تھی۔ بھوک کے مارے کلیجہ کھُرچ رہا تھا۔ نقاہت حس و حرکت کی روادار نہ تھی لیکن زندگی کی بقا کے واسطے معدے میں تدریجاً قلیل غذا کا پہنچانا ناگزیر تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح استراحت کی جگہ چھوڑ کے اٹھی، دو چار پھل توڑ کے کھائے۔ اتنے لذیذ اور شیریں میوے کھانے کا اتفاق اس ساعت سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب شکم پُری سے فارغ ہوئی تو بنی نوعِ انسان کی جستجو میں مختلف سمتوں کی گشت

شروع کی، گھنٹوں گھومتی رہی اور جب تھک تھکا کے دم لینے کے واسطے ایک جگہ بیٹھی، تو یہ دیکھ کر اُس کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ زینت اور منظر کی وہی حالت تھی جو غش سے آنکھ کھلنے کے بعد دیکھی تھی۔ وہی صبح کا سہانا سماں، وہی خنک ہوا کی فرحت کی، وہی افق پر طباشیر سحر کی نمود! اس نے خیال کیا کہ شاید جنت یہی ہے اور میں زندہ بہشت میں داخل کر دی گئی ہوں، لیکن یہ ناممکن تھا، بعض انبیا کے سوا کوئی بشر مادّی جسم کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ایک خاطی اور گنہگار عورت!

ہنوز وہ اسی خیال میں مستغرق تھی کہ کسی نامانوس آواز نے چونکا دیا۔ اُس نے متجسّس نگاہ سے دیکھا، سامنے ہی ایک عالیشان عمارت کھڑی تھی جس طرح قصّے کہانیوں میں جواہر نگار ایوانوں کا وجود سُنا جاتا ہے بالکل اسی نقشے پر یہ محل دکھائی دیا۔ قصر کی چوٹی پر طلائی نشان نصب تھا اور اس کا ضیا بار پرچم نشاط آفریں ہوا میں لہرا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا زریں پر عقاب بازو کھولے ہوئے فضا میں پرواز کر رہا ہے۔ دروازے پر نورانی حرفوں میں مرقوم تھا "نیک منزل" اس نے ارادہ کیا کہ سبزے سے اٹھ کر محل میں داخل ہو۔ ابھی صدر پھاٹک سامنے تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ اذانوں کی آوازیں بلند ہو چکی تھیں اور جمیلہ اسی طرح بیٹھی ہوئی چیں چیں کر رہی تھی"۔

شکیلہ بیگم نے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے سعادت اطوار بہو کو دیکھا۔

پرخلوص خدمت اور بے ریا ہمدردی سے متاثر ہوئی اور شفقت آمیز لہجے میں
میں بولی "بیٹی جمیلہ تم اب تک سوئی نہیں؟ پہاڑ سی رات بیٹھے ہی بیٹھے کاٹ دی!
نڈھال ہوگئی ہوگی، جاکے آرام کرو کہیں کہنے والی بندی کی طبیعت بدمزہ نہ ہو جائے"۔
جمیلہ۔ مجھے بالکل تھکن نہیں ہے کئی دفعہ سونے کا ارادہ کیا مگر نیند نہیں آئی!
خدا نہ کرے اب تو درد کی شکایت نہیں ہے؟
شکیلہ بیگم۔ شدنی تھی، ہوگئی۔ اب تو اللہ کا شکر ہے۔ البتہ ایک خواب دیکھا
ہے۔ نماز پڑھ کے بیان کروں گی۔
دونوں اٹھیں، وضو کیا، نماز پڑھی، پھر تلاوت سے فارغ ہو کر شکیلہ بیگم نے
اپنا خواب دہرایا۔ جمیلہ کے ذہن میں خود بخود اس کی تعبیر القا ہوئی لیکن اپنے منہ
سے کچھ نہ کہا۔ شکیلہ بیگم نے چند لمحے توقف کر کے اپنا خیال ظاہر کیا کہ "بیٹا! میری
سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ وہ کانٹوں سے بھرا اور تپتا ہوا جنگل جیسے جہنم کا ٹکڑا کہنا
غلط نہیں حقیقت میں ہم سے گنہ گاروں کے رہنے کی جگہ ہے کہ حکومت اور
اقتدار کے غرور میں زیردستوں اور چھوٹوں کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ جا اور بے جا
جبر اور تعدّی کیا کرتے ہیں۔ ان کی تکلیفوں کا احساس ہوتا ہے نہ آرام کی پروا۔ صرف
اپنی تن آسانی کا لحاظ رکھتے ہیں! اور وہ پرفضا صحرا جس کی بہاریں جنت کی یاد
دلاتی تھیں۔ اپنی "نیک منزل" سمیت ان پاک بیبیوں کے واسطے مخصوص
ہے۔ جو دنیا میں نیک اور بے شر زندگی بسر کرنے کی عادی ہیں۔ بڑوں کا ادب،

چھوٹوں کی نسبت، برابر والوں کی مساوات اور مستحقین کی امداد کا حق ادا کرنے میں کسی مشکل کو نہیں مانتیں۔ بیٹی جمیلہ! اگرچہ تم سن میں مجھ سے چھوٹی سہی لیکن اوصاف میں بہت بڑی ہو۔ تم نے اپنے اعمال سے سعادت اطواری کا مفہوم سمجھا دیا اور میں بدبخت سن رسیدہ ہونے کے باوجود اب تک دھوکے میں مبتلا رہی۔ عیب کو ہنر اور برائی کو بھلائی سمجھ کر اپنی بے وقوفی کا ثبوت دیتی رہی۔ اُن حماقتوں کا کچھ اندازہ گھر کی بے رونقی اور ابتری سے ہوتا ہے۔ شکر ہے۔ کہ اس علالت اور خواب نے آنکھوں کا حجاب دور کر کے حقیقت کا جلوہ دکھا دیا۔ اب میں خدا کو گواہ کر کے صمیم خاطر سے عہد کرتی ہوں کہ اس وقت سے تمام بری خصلتوں کو ترک کر دوں گی۔ ہر شخص سے اس کے مرتبے کے موافق سلوک کروں گی اور حقیقی معنوں میں انسان بن جاؤں گی لیکن خواہش یہ ہے کہ اب تک تمہارے ساتھ جو جابرانہ برتاؤ کرتی آئی ہوں تم انہیں معاف کر کے اپنا دل صاف کر لو۔"

جمیلہ۔ امی جان! بھلا میری مجال ہے کہ آپ کو الزام دے سکوں؟ چھوٹوں سے ہمیشہ خطائیں ہوا کرتی ہیں اور بڑے بوڑھے کبھی درگذر کرتے ہیں، کبھی تنبیہ سے کام لیتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں چھوٹوں کی بھلائی منظور ہوتی ہے۔ اگر خود دیکھا نہیں تو یہ ان کی بے نصیبی ہے۔ پھر بھی آپ میری زبان سے گستاخانہ جملہ سننا چاہتی ہیں تو حکم سے کوئی چارہ نہیں۔ بس تمام ان باتوں کو معاف کرتی ہوں۔ جو آپ کی رائے میں زیادتی پر محمول ہیں۔

شکیلہ بیگم! گلے لگا کے: "بیٹی! تم نے میرے دل سے بڑا بوجھ ہٹا دیا۔ خدا تم کو شاد اور با مراد زندگی عطا کرے، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ تم خاندان کا فخر اور گھر کی روشنی ہو۔ افسوس ہے کہ اب تک میں تمہاری قدر نہیں جان سکی۔ خیر! یہ بھی غنیمت ہے کہ اب ہوش آیا۔ شاید دیر آید درست آید ہی کی مصلحت ہو۔"

قیصر اور افسر حسین کو علی گڑھ سے واپس آئے کئی ہفتے ہو گئے۔ قیصر نے اعلیٰ ذہانت کی مثال پیش کرتے ہوئے اول درجے میں بی۔ اے پاس کیا۔ جن میں وکالت حاصل کرنا طے ہوا اور مراجعت کے بعد ہی قانونی مطالعہ شروع کر دیا گیا۔ وہ اپنی بیوی کی معصومیت اور اطاعت گذاری کا دل و جان سے ممنون ہے۔ خصوصاً اس واقعہ سے باغ باغ ہو رہا ہے کہ غیبی تائید کی بنا پر اس کی محدود سطیع والدہ نے زود رنجی کی نامقبول صفتوں کو ترک کرتے ہوئے خوش مزاجی اور خندہ جبینی کا ذخیرہ اختیار کر لیا ہے۔ اب غصہ۔ . اس کے قریب نہیں جا سکتا۔ خطاؤں سے درگزر کرنا عادت کا جزو بن گیا ہے۔ بالخصوص ساس بہو کا میل ضرب المثل بننے کے لائق ہے۔ صرف مزاجی تبدیلی پر کفایت نہیں ہوئی۔ اس نے گزشتہ بے عنوانیوں سے نادم ہو کے افسر حسین، قیصر بلکہ گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد سے معذرت کر لی ہے۔

خانہ داری کا انتظام جمیلہ کو تفویض ہوا ہے۔ اس کے سلیقے اور خوش نظمی سے

طمانیت اور سکون نمایاں ہے۔ سارا مکان ہنستا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دلخراش ہنگامے باہمی اتحاد کے گہوارے میں سو گئے ہیں۔

قیصر نے پھر اپنا پرانا طرزِ عمل جاری کر دیا ہے۔ قانونی اسباق اور زندہ دل احباب سے نپٹ کر آٹھ بجے گھر میں آتا ہے تو جمیلہ کو پورے انہماک کے ساتھ گھریلو کاموں میں مشغول پاتا ہے۔ انتظامات سے فراغت ہونے پر دسترخوان چنا جاتا ہے۔ پھر گیارہ بجے شب تک کسی دلچسپ موضوع پر گفتگو ہوتی ہے۔ بافانونی اور اخلاقی مطالعہ ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آرام کا وقت آجاتا ہے۔

ایک رات کو قیصر کا سبق نسبتاً آسان تھا، مطالعہ سے جلدی فارغ ہو گیا صبح اتوار بھی تھا۔ اس لئے اُس نے جمیلہ کی لطیف باتوں میں کسی قدر زیادہ وقت صرف کرنا طے کیا اور دونوں میاں، بیوی مختلف اقسام کی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ حال اور مستقبل کے بعد ماضی کی باری آئی۔ تو جمیلہ نے شرکا بیت کا پہلو لیے ہوئے مسکرا کر کہا "کسی کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ لاکھ احتیاط برتی جائے مگر کسی نہ کسی موقعہ پر مرد بے وفائی کر گزرتے ہیں"

قیصر کے دل میں جمیلہ کی لفظیں نشتر بن کے چبھیں، ہر چند واقعات کی تردید ممکن نہ تھی لیکن اس نے عارفانہ تجاہل کو سپر کرتے ہوئے جواب دیا "کلیہ قائم نہ کرو کیوں کہ ع خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

مثال کے طور پر میں ہی تمہارے مجوزہ نظریہ سے مختلف ہوں"

جمیلہ (طنز بہ تبسم سے) کیوں نہیں ؟ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ علی گڈھ سے خارج الایوان کئے جانے کا فوری فرمان صادر ہوا تھا۔ اگر خطا قصور روا فت کیا جائے تو کچھ نہیں ؟

یہ بحث اس درجہ معقول اور صریح تھی کہ قیصر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ندامت کی بہتات سے بغلیں جھانکنے لگا۔

جمیلہ نے جو قیصر کا یہ حال دیکھا تو دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔ حقیقتہً اس نے محض تفریح کی نیت سے گفتگو کا یہ عنوان اختیار کیا تھا، میاں کی دل شکنی یا شرمندگی منظور نہ تھی۔ اب اس کو یہ فکر تھی کہ کسی اچھے اسلوب سے اس تذکرے کو دفع کرنا چاہیئے۔ تھوڑے سکوت کے بعد بولی۔

"خدا نے صرف عورتوں ہی کو اس شرف سے نوازا ہے۔ کہ وہ مردوں کی شرمندگی بھی برداشت نہیں کر سکتیں اور معذرت سننے سے پہلے گزری ہوئی غلطیوں کو معاف کر دیتی ہیں۔"

قیصر (خوش ہو کر) سچ کہو، کیا تم نے میری شقاوت کو عفو کر دیا ؟ سچ مُچ تم نے معصومیت کی حد کر دی ! مجھے اپنی قسمت پر بجا ناز ہے۔ کہ تم سی پاک باطن اور نیک نہاد خاتون کو اپنی زندگی کا شریک کر سکا، تم نے میری حیات کے تمام شعبوں کو جگمگا دیا اور ——————"

جمیلہ (منہ پر ہاتھ رکھ کے) خدا کے لیئے بس ! میں بے وقت کی راگنی سننا

نہیں چاہتی۔

قیصر: نہیں تو، یہ بے ہنگام راگ نہیں ہے بلکہ میرے دلی جذبات کی ترجمانی ہے۔ تم ان باتوں سے محظوظ ہونا نہیں چاہتیں تو خیر جانے دو۔

مختصر تقریر کے بعد جمیلہ نے محجوبانہ ادا سے آنکھیں زمین میں گاڑ دیں۔ اور قیصر کے دونوں پرشوق ہاتھ بلند ہو کر اس کے گلے میں حمائل ہو گئے:

ظریف ایڈیٹر

خلیل اگرچہ مہذب گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور قدیم اصول کو دیکھتے ہوئے اعلیٰ تربیت یافتہ کہے جانے کا سزاوار تھا لیکن اتفاقات نے رائج الوقت مغربی علوم سے بے نیاز ہی رکھا تھا۔ اس کی طبیعت کچھ ایسی چھنی واقع ہوئی تھی کہ کوئی مفید پیشہ یا ملازمت اختیار کرنے کے بدلے زبان کی شاعرانہ نازک خیالیوں پر مٹا ہوا تھا۔ اس کی جدت طراز طبیعت کی انوکھی اختراعیں، لطیف استعارات تخیل کی بلند پردازی کا آئینہ تھے یہی اسباب تھے کہ آٹھوں پہر ایک نشہ، ایک سوچ میں گم سم رہتا تھا۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اہم مسئلہ حل کرنے میں منہمک ہے۔ خیالی دنیا کی سیر اس کا بہترین مشغلہ تھا اور خیالی عمارتیں تعمیر کر کے انہیں منہدم کر دینا روحانی انبساط کا موجب تھا۔ کوئی معمولی سا چٹکلہ اس کے سامنے چھوڑ

چھوڑ دیا جائے، پھر دیکھئے کہ اس کے متعلق کیسی لطیف خیال آفرینیاں ہوتی ہیں۔ خوبصورت، خوبصورت استعارے، حسین و جمیل تشبیہیں، شستہ لفظوں کے رشتے میں کتنے دل پذیر سلیقے سے منسلک کئے جاتے ہیں! کسی چیز کی توجیہہ اور شرح کرنے میں اس کا موشگاف قلم حیرتناک کمال کا مظاہرہ کرتا تھا۔ انہیں خوبیوں کا یہ اثر تھا کہ اکثر جوہر شناس مبصروں نے اس کی ہمہ گیر طبیعت کا لوہا مان کر ایک مسلم الثبوت ادیب تسلیم کر لیا تھا۔ معاصرین کی صف سے نکال کر اسے بلند مرتبے پر فائز کرنے والی مخصوص صفت یہ تھی کہ ہر خیال ٹھیک وقت پر سوجھ جاتا تھا اور حاضر باش طبیعت اس خیال کو ادا کرنے کے واسطے ایسے شگفتہ الفاظ اور فصاحت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جملے پیش کرتی تھی کہ سامعین بے اختیار پھڑک اٹھتے تھے۔ مشرقی مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے مجلسی علوم کا فقید المثال عالم کہا جا سکتا ہے۔ غالباً یہی اسباب تھے کہ امیروں کی محفلیں خلیل کے بغیر پھیکی معلوم ہوتی تھیں جس صحبت میں پہنچ جاتا تھا، پذیرائی کے لیے آنکھیں بچھ جاتی تھیں۔

اس نے نواحی ریاستوں کے سوا اودہ سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ مگر بڑھا ہوا تجربہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہونا ظاہر کرتا تھا۔ اس کے مزاج میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہاں مذہبی پختگی اور زہد و تقویٰ کی بھی کمی نہیں تھی۔ پانچ وقت کی نماز اور مہینہ بھر کے روزے اہم ترین عذر کے سوا کبھی

قضا نہ ہوتے تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ اُسے کوئی وظیفہ ملتا تھا نہ جاگیر اور جائداد کی آمدنی تھی۔ جس پر معاشی املاک کھڑی رہ سکتی۔ تاہم قدر دان رئیسوں نے مدد معاش کے طور پر ماہانہ وظیفے مقرر کر دیئے تھے۔ یہی آمدنی اُس کی کفالت اور متوسط زندگی کی ضمانت دار تھی۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی اُس کی عملی زندگی بالکل تاریک اور مفلوج تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں اُس کا وجود محض ہنسنے ہنسانے کے لئے ہے۔

زندگی کے گراں بہا ایام ضائع ہوتے دیکھ کر اس کے عاقبت بین رشتے دار دل نے مشورہ دیا۔ کہ اِس آوارگی اور بے کاری سے بچنے کے لئے کسی اچھے صیغے میں ملازمت اختیار کر لینا چاہیئے۔ تقدیر یاور ہوئی تو ترقی کے مدارج طے ہو جائیں گے اور ضعیفی میں سُکھ نصیب ہوگا۔ اگر آزادی پسند طبیعت پابندی کی متحمل نہیں ہے۔ تو کوئی آزاد پیشہ قبول کرنا چاہیئے۔ تجارت اتھاہ سمندر ہے جس کا اور چھور نہیں۔ بڑھے تو بے پایاں نہیں تو کروڑوں کا سرمایہ غرقاب، کاروبار معیوب نہیں، رسل پیغمبروں نے سوداگری کی آمدنی کو اکلِ حلال بتایا ہے رئیسوں، امیروں کے ہاتھ کا کھلونا بن کر اُن کے مقرر کئے ہوئے وظیفوں پہ اعتبار کرنا دانائی نہیں، خوش ہیں تو سب کچھ ورنہ طوطے کی طرح آنکھیں پھری ہوئی ہیں، مروّت کو بار ملتا ہے نہ انسانیت دخل پاتی ہے۔

خلیل نے نصیحتوں کو سُنا تو سہی مگر کسی رائے کو قبول نہ کر سکا۔ اُسے احباب کی خوشنودی اور شعر و سخن کے سوا کسی کام سے سروکار نہ تھا۔ یہی اس کی زندگی تھی اور یہی زندگی کا مقصد تھا۔ جب یہ حالت ہو۔ تو نصیحت گروں کی مخلصانہ سعی کب تک جاری رہ سکتی ہے؟ آخر سمجھانے والے بہ تنبہ ذہن ہو کے بیٹھ رہے اور خلیل دل پسند اعمال کے لئے مطلق العنان ہو گیا۔ اسے شعر شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں بھی خاصی مداخلت تھی۔ جس موضوع یا مبحث پر قلم اٹھاتا تھا۔ بڑی بے تکلفی کے ساتھ پھولوں کے ڈھیر لگاتا چلا جاتا تھا۔ اس کے متعدد مضمون اُردو کے اخباروں اور رسالوں میں فرضی ناموں سے چھپ چھپ کے مقبول ہو چکے تھے۔ لیکن نثاری صرف تفنّن کی نیت سے تھی۔ حالانکہ قابل مدیروں نے اس کی طبیعت داری کا اندازہ لگاتے ہوئے کوشش کی کہ اس کے گراں پایہ مضامین کا تسلسل قائم ہو جائے مگر خلیل کی بار باشی نے کامیاب ہونے کا موقعہ نہیں دیا۔

جب خلیل کی آزادی حد سے گذرنے لگی تو اس کے قریبی رشتہ داروں نے مشاورت کر کے اسے جلد سے جلد شادی کی زنجیر میں جکڑ دینا طے کر لیا۔ ان کے خیال میں آوارہ گردی کا واحد علاج متاحت ہو سکتا تھا۔ متاہل زندگی کی ضرورتیں دن کا داہی تباہی پھرنا اور راتوں کو گھر سے غیر حاضر رہنا چھڑا دینے میں اکسیر سے کم نہیں۔ چونکہ خلیل طبعاً نیک اور نوعمر تھا۔ قبول صورتی میں بھی

سوچا اس سے نہیں تو دس بیس سے یقیناً بہتر متصور ہو سکتا تھا۔ ماسوا جس خاندان میں پیدا ہوا تھا اُس میں لڑکوں کا قحط تھا۔ نوکری چھوٹتے ہی فی الفور ایک جگہ نسبت لگ گئی۔ گویا چٹ منگنی پٹ بیاہ کی مثل صادق آئی ہے یعنی ایک مہینے کے اندر اندر مہندی، ساچق، مانجھا، برات اور عقد کے تمام مرحلے ختم ہو گئے۔

خلیل اپنی بے بضاعتی اور آزاد طبعی کی بنا پر اس شادی کو اپنے حق میں عظیم مصیبت سمجھتا تھا۔ اگر مشرقی اصول کے برخلاف اس کی رائے ضروری خیال کی جاتی تو شاید وہ سختی سے آخر تک اس کی مخالفت پر قائم رہتا لیکن ہندوستانی رواج، شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکے لڑکی کا مشورہ بے معنی خیال کرتا ہے اور انہیں اتنا موقعہ بھی نہیں دینا چاہتا کہ وہ اپنے مستقبل پر غور بھی کر سکیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی بچے بچیوں میں اخلاقی جسارت کا فقدان ہے اور شادی بیاہ کے معاملے میں اپنی زبان کو حرکت دینا گناہ کا مرادف تصور کرتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کی غلط تجویز ان کی زندگی تباہ ہی کیوں نہ کر دے مگر وہ ناسعادت اطوار اور بے غیرت کہلانے کے خوف سے زبان کو جنبش نہیں دیتے۔ بعد میں بے جوڑ شادی سے جو روح فرسا مصائب ظاہر ہوتے ہیں۔ انہیں تقدیر کا عطیہ سمجھ کے اس گھڑی تک گوارا کرتے ہیں، جب تک سانس کا رشتہ منقطع نہیں ہوتا۔

رسوم اور قیود میں جکڑے ہوئے خلیل کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔

نکاح سے پہلے جب احباب کی صحبتوں میں ذکر چلا۔ تو اس نے شادی کی مخالفت میں طاقت کا سارا زور ختم کر دیا۔ معقول معقول عذرات دکھائے کسی نے زد و بد کی تو نظیروں اور رہنماؤں کو سامنے لا کر قائل کیا لیکن اخلاقی کمزوری سے بس نہ چل سکا۔ جب سرپرستوں نے خلعت اور سہرے سے آراستہ کر کے دولہا بنایا۔ اور زرنگار مسند پر محفل میں لا بٹھایا تو دم زدن کی مجال نہ ہوئی۔ ایجاب اور قبول کے وقت بھی میاں مٹھو کے اندر ہونکارا بھر دیا۔ پانچ سو کی مقدرت نہیں لیکن پچاس ہزار کا مہر یوں منظور جیسے قارون کا خزانہ گھر میں رکھا ہے! اسلامی سادگی رسم و رواج کی رنگینی پر نثار کر دی مگر کانوں پر جوں نہ رینگی! چوتھی چالے اور ولیمہ تک تو کچھ محسوس نہ ہوا۔ ان رسموں کے اختتام پر وہ زندگی شروع ہوئی جو متاہل کہی جاتی ہے۔

خلیل کے خسر ہمایوں مرزا تھے تو غریب لیکن بیٹی کی تعلیم اور تربیت میں بڑی بڑی قربانیوں سے روگردانی نہیں کی تھی۔ ایک خدا رسیدہ آنوں سے علمی تعلیم دلوائی تھی۔ دینیات کی کتابیں لڑکی کے نانا مولوی فیض علی نے پڑھائیں۔ حساب کتاب خود سکھایا۔ اور خانہ داری کی تربیت کے لئے ماں کا سایہ موجود ہی تھا۔

عصمت النساء بیگم جس طرح علمی دولت سے مالا مال تھی اور اس دور میں غریب ہونے کے باوجود نسوانی طبقے کا فخر تصور ہوتی تھی ویسے ہی اخلاق اور باطنی محاسن سے بھی دلہن بنی ہوتی تھی۔ فطرت نے اسے اپنی بیش بہا نعمتوں سے سربلند کرنے میں پوری حاتمی سے کام لیا تھا۔ صورت شکل کے اعتبار سے بھی

اُس کا شمار جمیل لڑکیوں میں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ خلیل کی نصیبہ وری تھی کہ عصمت النسا بیگم سی دلہن پائی۔

شادی کے تمام لوازمات ختم کر سکنے پر خلیل "چہ کنم" کا مسئلہ حل کرنے میں اُلجھ گیا۔ اکثر اپنی اخلاقی کمزوری پر ملامت کرتا اور تاریک مستقبل کا خطرہ سہمائے رکھتا۔ وہ شاعرانہ دل و دماغ رکھنے کی حیثیت سے پورا پورا بلبل اسیر تھا، صیاد ول نے جس کی آزادی چھین کر قفس میں بند کر دیا تھا۔ تجردانہ زندگی میں روزی کی تلاش تھی نہ کھلانے کی فکر، جہاں دسترخوان بچھا پایا دو چپاتیوں اور تھوڑے سے خشکے سے پیٹ بھر لیا۔ اب یہ بے فکریاں خواب و خیال بن گئیں تھیں تحمل کی طاقت نہ ہونے پر بھی گرہ داری کا سارا بوجھ سر آپڑا تھا۔

عصمت النسا بیگم ذکی اور ذہین، فہمیدہ اور متین حسین اور جمیل ہونے کے باوجود خلیل کی محبت پاش نظر حاصل نہ کر سکی۔ جب تک گھونگھٹ نہیں اُلٹا تھا خاموشی کے ساتھ طور طریقے دیکھتی رہی۔ مگر گھر کا انتظام سنبھالنے کے بعد میاں کی وحشت اور بے تعلقی نے اس کے دل میں وہم پیدا کر دیا اور وہ بڑی سنجیدگی سے مزاج کی تھاہ لینے لگی۔

کئی ہفتوں کی مسلسل دماغ سوزی بھی اصلی وجہ کا راز معلوم نہ کر سکی تاہم وہ مایوس نہیں ہوئی۔ اپنی کوشش میں مشغول رہی۔ ساتھ ہی ساتھ احتیاط کا

ذہن بھی چھوٹنے نہیں پایا۔ طور طریقوں سے دلی کاوش ظاہر نہیں کی۔ شارع نے زوجہ کی حیثیت سے جو فرائض اس کی ذات پر عائد کر دیئے تھے۔ انہیں ادا کرنے میں تساہل نہیں کی اور خلیل کے آرام کا پورا خیال رکھا۔ خلیل کو بھی ان آسائشوں کا احساس تھا۔ وہ عمیق نظروں سے بیوی کی خدمت گذاریوں کا معائنہ کرتا رہتا تھا۔ خانہ داری کا سارا بوجھ تنہا بیوی پر چھوڑ دینا گوارا نہ ہوا۔ ہاتھ بٹانے کے لئے ایک ماما ملازم رکھ دی۔ جو اوپر کا سب کام انجام دے کر اسے فارغ البال کر دیتی تھی۔

جس مکان میں خلیل کی بود و باش تھی وہ قدیم ایشیائی طرز کا بنا ہوا تھا۔ صحن، دالان، کمرے، کوٹھڑیاں، باورچی خانہ، حمام، پائخانہ سبھی کچھ تھا۔ کھلی ہوئی کشادہ چھت اس پر ہوادار کمرہ گرمی اور برسات کے لحاظ سے تعمیر تھا لیکن خلیل کے لاابالی پن نے ایسے آرام دہ مکان کو کھنڈر کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ چار چار چھ چھ روز کی مسلسل غیر حاضری، اور اعلیٰ درجے کی بے غوری سے بعض حصے منہدم ہو گئے تھے۔ جو باقی تھے وہ بھی ناپرسی کا شکار بن کے سسک رہے تھے۔ اینٹیں کھیسے کاڑھے بیکسی کا ماتم کر رہی تھیں۔ چھتا بیں اور دھنیاں بھی قریب قریب رفاقت کا حق بخشوا چکی تھیں۔ شادی سے فارغ ہو کر خلیل نے ادھر توجہ مبذول کی۔ چند بڑھئی اور راج مزدور لگا کے نئے سرے سے مکان کی مرمت کرا دی۔ گرہستی کے لئے جو سامان ناگزیر ہوتا ہے آہستہ آہستہ وہ بھی فراہم کر دیا۔ اور ظاہر بظاہر بیوی کے وہ حقوق ادا کر دیئے۔ جو شارع اور جماعت نے اس کی

ذات سے متعلق کیے تھے عصمت النساء بیگم نے نسوانی سلیقے سے کام لے کر انہیں بہ طور پہ سجا دیا۔

خلیل کو بیوی کی سلیقہ مندی اور صفائی نے خوش تو کیا لیکن آزادی چھن جانے کا خیال ایسا نہ تھا جو پر شباب چہرے کو پھول کی طرح شاداب رہنے دیتا۔ ہر چند راتوں کی غیبت میں کمی ہو گئی تھی۔ پھر بھی گیارہ بارہ بجے رات سے پہلے مکان آنا نہیں ہوتا صبح کو جب تک کھانا نہ کھایا جاتا گھر میں رہتا مگر کھانے سے فارغ ہو کر جو نکلتا تو سونے کے وقت سے پہلے نہ لوٹتا۔

ایک دن علی الصباح آنکھ کھلی تو نماز کا وقت تنگ تھا۔ جلد جلد وضو کیا، نماز پڑھی اور فارغ ہو کر گلوری کی فرمائش کی۔

عصمت۔ منہ تو دھو لو۔

خلیل۔ ہاں اٹھتا ہوں تم گلوری بناؤ۔

عصمت۔ بنانے کو تو بنا دوں گی لیکن برا نہ مانو تو ایک شرط ہے

خلیل نے پہلے پہل بیوی کی زبان سے شرط کا جملہ سن کر حیرت سے منہ دیکھا کچھ غور کیا، پھر پوچھا۔ کیسی شرط؟

عصمت۔ پہلے وعدہ کرو کہ جو پوچھوں گی اس کا صحیح جواب دو گے؟

خلیل (کچھ سوچ کر) معلوم ہو گا تو ضرور بتا دوں گا۔

عصمت۔ تمہاری ہی بات اور تمہیں نہ معلوم ہو

خلیل۔ میری بات ہے تو نہانے میں بھی عذر نہ ہوگا۔

عصمت۔ میں دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ تم آٹھوں پہر اداس کیوں رہتے ہو؟ جب گھر سے جانے لگتے ہو تو تمہارا چہرہ بحال ہو جاتا ہے لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی منہ پر پژمردگی چھا جاتی ہے۔ اگر میری دل جوئی اور اطاعت تمہاری مرضی کے خلاف ہے تو وہ باتیں بتا دو جو تمہارے دل کو مسرور کر سکیں۔ شاید نادانستگی میں کوئی تقصیر ہو گئی ہو تو آگاہ کر دو کہ آئندہ تمہارے مزاج کے خلاف کوئی امر نہ ہو۔

خلیل (تھوڑے سکوت کے بعد) اصل قصہ یہ ہے کہ میں آزاد طبیعت واقع ہوا ہوں تمہاری وجہ سے میری آزادی میں فرق پڑا ہے۔ یہی غم سکوت کا باعث ہے۔ غالباً تم کو معلوم ہوگا کہ نہ میرا کوئی وثیقہ ہے نہ جائداد ہے کہ اس کی آمدنی معیشت کی کفیل ہو۔ میرا پیشہ مصاحبت ہے۔ امیروں کی خدمت میں حاضر رہ کر دلچسپ چٹکلوں سے خوش کرتا ہوں تو ان کی سخاوت سے روٹیاں چلتی ہیں۔ دشواری یہ ہے کہ امرا کی مجلسیں دن کے بدلے راتوں کو گرمانی ہیں۔ تمہارے خیال سے شب کو گھر سے قدم نہیں نکال سکتا۔ جب روزانہ ناغہ ہوگی تو وظیفے موقوف ہو جائیں گے اور افلاس کا بھوت گلا دبانے کو آموجود ہوگا۔

عصمت۔ یہ تو کوئی ایسی مشکل نہیں ہے جس کا تدارک نہ ہو سکے۔ خدا کے فضل سے پڑھے لکھے ہو۔ شعر و شاعری میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ جہاں چلے

جاؤ گے نوکری قدموں سے لگی ہے۔

خلیل۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اردو فارسی کی قدر ہو۔ عربی تو پوچھی ہی نہیں جاتی۔ البتہ انگریزی یا پھر ہندی والوں کے لئے ملازمت کا زیادہ امکان ہے۔

عصمت۔ یہ خیال درست نہیں۔ خدا نے علم کو مرتبہ دیا ہے کیسی طرح کا بھی ہو اس کے قدرداں ضرور ملیں گے۔

خلیل۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں نے عربی فارسی کا پورا نصاب بھی ختم نہیں کیا ہے۔

عصمت۔ یہی تمہارا کمال ہے کہ محض اردو دانی کے بل بوتے پر ایسے اچھوتے مضامین لکھ ڈالتے ہو کہ بڑے بڑے قابلوں کو نصیب نہیں ہوتے۔ افتخار بھائی کہتے تھے کہ مخبر اخبار کا ایڈیٹر تمہارا بڑا مداح ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر تم پچاس روپے ماہوار قبول کرو تو وہ اپنے اخبار کی ادارت پیش کردے۔

خلیل۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خیال درست ہو لیکن اپنی آزاد طبعی سے یہ امید نہیں کہ دس بجے دن سے پانچ بجے شام تک پاؤں توڑ کر دفتر میں بیٹھ سکوں۔ اس کے علاوہ اخبار کے فرائض اور ذمہ داریاں کٹھن ہوتی ہیں۔ شاید میں اس بار کا متحمل بھی نہ ہو سکوں گا۔

عصمت۔ جس کام کی عادت نہ ہو اس سے طبیعت بھاگتی ہے۔ اگر افتخار بھائی سے کہا جائے تو وہ تمہاری طرح رات رات اور دن دن بھر آوارہ گردی میں مصروف رہیں تو اسی طرح تھکی میں جواب دیں گے۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ

اگر سرکاروں سے میرے وظائف بند ہو جائیں تو میں کچھ نہیں کر سکتا اور رسات بھر گھر سے غائب رہنا امکان سے خارج ہو چکا ہے۔ خدانخواستہ آمدنی کا یہ دروازہ بھی بند ہو گیا تو کیا کرو گے؟

خلیل۔ مجبوری انسان سے ٹوکری ڈھواتی ہے۔

عصمت۔ اس صورت میں اگر تم خود ہی کنارہ کر لو تو کیا برائی ہے؟ بلکہ ایک فائدہ یہ ہے کہ جب چاہو گے تفریحاً ان صحبتوں میں شریک ہو سکو گے لیکن قصور وار بن کے نکالے جانے کے بعد یہ بات حاصل نہ ہو گی۔

خلیل۔ تمہارا کہنا سچ ہے لیکن لگا لگایا عزت کا روزگار آپ سے چھوڑنا اچھا نہیں ہوتا۔

عصمت۔ تعجب ہے کہ تم سمجھ دار ہو کے ایسا کہتے ہو۔ اگر ایک غریب امیروں کی صحبت میں جا کے اٹھے بیٹھے گا اور جیسی باتیں تم کرتے ہو، کرے گا تو عوام اُسے خوشامد خور یا دستر خوان کی مکھی کا لقب دیں گے جس کی رکاکت ظاہر ہے۔

خلیل (متفکر ہو کر) خیر! میں تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔

عصمت۔ ہاں! خوب سوچ سمجھ لو پھر جو صورت بہتر معلوم ہو اُسے اختیار کرو۔ میری رائے میں تو تمہیں منظور کر لینا چاہیئے۔ اس ملازمت میں عزت بھی ہے اور شہرت بھی ہے ترقی کا امکان بھی ہے اور ملک و قوم کی خدمت کا سچا افتخار بھی ہے آیندہ تمہیں اپنے فعل کا اختیار ہے۔

خلیل ان فائدوں کے ساتھ محنت و مشقت بھی بہت ہے۔ بہرکیف دو چار روز غور کر کے جواب دوں گا۔

زمانہ دو مہینے کی مسافت طے کر گیا۔ خلیل کے مزاج میں بڑی حد تک آشتی آ گئی ہے۔ وہ صرف معینہ اوقات پر باہر جاتا اور رات کو مکان میں موجود رہتا ہے۔ عصمت النسا بیگم نے اطاعت اور خدمت گزاری کے چلتے ہوئے جادو سے اس کے ضمیر پر قبضہ کر لیا ہے اور اعجاز بیانی کے زور سے خلیل کے خیالات میں بھی بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اس کی فطری اور نوعی سلیقہ مندی اور کفایت شعاری نے اجڑے پچڑے گھر کو بہشت کا نمونہ بنا دیا ہے۔ نخنوں کا چوکا صاف ستھرا فرش، پلنگ، صندوق، تلنے کے قلعی دار گگرے، شیشے، مٹکے، چینی اور مسی ... ظروف غرض متوسط گرہستی کے لئے جو چیزیں ناگزیر ہیں سب مہیا ہیں۔ آرائشی حیثیت سے بھی کوئی کمی محسوس نہیں کی جاتی۔ خود عصمت النسا بیگم کے ہاتھ گلے میں بھی طلائی زیورات ہیں۔

یہ سب کچھ عصمت النسا بیگم کی ذہانت نیکی اور سلیقہ شعاری کا طفیل ہے۔ اس نے برمحل نصیحتوں اور تدبیر منزل سے کام لے کر خلیل کے چال چلن کو بڑی حد تک درست کر لیا ہے۔ تاہم گزشتہ صحبتوں کی للک کبھی کبھی رمیدہ ہرن کی طرح سے اڑتی ہے اور وہ بند شیں توڑ کر پھر انہیں محفلوں کی شمع بننا چاہتا

ہے۔ جہاں کی زہریلی فضا نے اس کی زندگی کو گھن کی طرح کھالیا تھا۔ اور وہ طبعی شرافت سی بے بہا نعمت سے محروم ہو چلا تھا۔

یہ رمیدگی عصمت النسا بیگم کے عملی جوش کو سرد کرنے کے بارے کچھ اور گرما دتی اور وہ پہلے سے زیادہ مستعدی اور دانشمندانہ اصول اختیار کر لیتی۔ جس سے خلیل کو بغیر چون وچرا کے اس کی دلیلیں تسلیم کرنا پڑتیں۔ اور وہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے وہی راستہ اختیار کر لیتا۔ جدھر عصمت النسا بیگم لے جانا پہنچی۔ اب اس کو مصاحبت اور جی حضوری کے نامعقول اصول سے تنفر سا پیدا ہو چلا ہے۔ امیروں کی صحبتیں اس کے وجود سے خالی دکھائی دیتی ہیں لیکن اس احتیاط نے اقتصادی کشمکش پیدا کر دی ہے۔ اس کی آمدنی گھٹتے گھٹتے صرف پندرہ روپے مہینے کی رہ گئی ہے۔

خلیل کے حق میں آمدنی کی کمی سوہانِ روح ہو گئی ہے۔ وہ رات دن اسی فکر میں گھلا کرتا ہے۔ کہ کیا وسائل اختیار کرنا چاہئیں جس سے عزت کے ساتھ پیٹ کا دھندا بھی چل سکے۔ ایک دن اسی تفکر کی حالت میں بیوی سے مشورہ طلب کرنے کا خیال آ گیا۔ فوراً ذہن نے مخبر اخبار کی یاد تازہ کر دی۔ اس نے سوچا کہ اگر اخبار کی ادارت قبول کر لی جائے تو فی الحال پچاس روپے مہینہ ملے گا۔ آئندہ ترقی کی بھی امید ہے لیکن اخبار کی ذمہ داری اور فرائض برداشت کرنے کی طاقت معلوم نہیں ہوتی۔

کوئی شبہ نہیں کہ وہ بڑی غلطی میں مبتلا تھا۔ مضامین تو اکثر لکھ لکھ کر چھپوائے تھے مگر اوارت کے فرائض پورا کرنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہی سبب تھا۔ کہ وہ تذبذب میں مبتلا تھا۔ ادھر سے ہٹ کر اس کے تخیل کی رو تجارت کی طرف مائل ہوئی اُس نے سوچا کہ ہزار بارہ سو کے سرمایہ سے کوئی چھوٹی موٹی دکان کھول دینا بہتر ہوگا۔ دشواری یہ تھی کہ سردست اتنا سرمایہ کہاں سے آئے؟ عصمت النسا بیگم کا زیور فروخت ہو تو اتنا روپیہ آسانی سے فراہم ہو سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ اُن سے مانگے کون۔ فطری غیرت زبان کھولنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ اپنے میکے کی چیزیں دینے سے بخل نہیں کریں گی تاہم ذاتی جمیت بھی کوئی چیز ہے؟ اسی عنوان سے اکثر تدبیریں ذہن نشین ہوئیں۔ اور خلیل نے خود ہی ان سب کی تردید کر دی۔

ایک دن اسی ادھیڑبن میں ساری رات نیند نہیں آئی صبح کو جب فجر کی نماز سے فارغ ہو چکا تو بیوی سے ادھر اُدھر کی چند باتیں کرکے مطلب کا ذکر چھیڑا "جس بات کا اندیشہ تھا آخر وہی معاملہ پیش آیا۔ سب سرکاروں کے یہاں سے وظائف بند ہو گئے۔ صرف دو بوڑھیوں سے پندرہ سولہ روپے مل جاتے ہیں۔ اول تو ان سے مہینہ بھر کا خرچ پورا نہیں پڑتا۔ اُس پر طرہ یہ ہے کہ یہ آمدنی بھی عنقریب بند ہونے والی ہے۔ میری عقل تو چکر میں پڑ گئی ہے کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ تمہارے خیال میں کوئی مفید کام ہو تو بتاؤ۔"

عصمت۔ تم نے بھی کوئی تجویز کیا ہے؟

خلیل۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکا کہ میری سمجھ میں خاک نہیں آتا۔

عصمت۔ میں نے پہلے بھی ایک دفعہ "مخیل" اخبار کی ادارت قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا اور آج بھی وہی کہتی ہوں

خلیل۔ تمہاری رائے کی اصابت میں تو کلام نہیں، لیکن مجھ سے اتنی سخت پابندی برداشت نہ ہوگی۔

عصمت۔ کیوں؟

خلیل۔ ہمیشہ آزادی کی فضا میں بسر ہوئی محنت اور ایک جگہ بیٹھنے کا عادی نہیں۔

عصمت۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تمہیں علمی صحبتوں میں شریک ہونے کا اتفاق کم ہوا ہے۔ جن محفلوں میں رہے ہو انہیں علم و ادب سے علاقہ نہ تھا۔ چوبیس گھنٹے کی نشست و برخاست نے تم میں وہی خصلتیں پیدا کردیں، لیکن قدرت نے تمہارے دل و دماغ میں جو قابلیتیں ودیعت کر رکھی ہیں۔ وہ عملی جد و جہد سے مناسب ہیں۔ فی الحال تم کو محنت کا خوف پہاڑ بن کے ڈراتا ہے، مگر جب اس میدان میں قدم رکھو گے تو یہ بات جاتی رہے گی۔

خلیل۔ بات تو قرینے کی ہے، مگر میں نے کبھی ایسے کام کئے نہیں۔ اس واسطے ہچکچاتا ہوں۔

عصمت۔ جب تم پہلے پہل امیروں کی صحبت میں داخل ہوئے ہو۔ اُس وقت کیا گمان تھا؟ کیا اپنے آپ کو ان محفلوں کا اہل تصور کرتے تھے؟

خلیل۔ بالکل نہیں۔ رفتہ رفتہ اُن کے مزاج اور مذاق کا اندازہ ہوگیا۔

عصمت۔ اُسی طرح آہستہ آہستہ علمی کاموں کے خوگر ہو جاؤ گے۔ چند روز بعد خدا نے چاہا تو ادیب اور شاعر کے معزز لقب سے مشہور ہو گے۔ آج جن صحبتوں میں مسخرے سے زیادہ وقعت نہیں ہے۔ کل انہیں صحبتوں میں علم و ادب کے خادم ہونے کی حیثیت سے ممتاز جگہ پاؤ گے۔

خلیل۔ ایک بات کہوں، برا تو نہ مانو گی؟

عصمت۔ تم نے میرا مطلب سمجھنے میں سہو کیا۔ حقیقت میں بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا غریبوں کی عزت کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب قدر و منزلت کے ساتھ ہو۔ ورنہ یوں تو خادموں کو بھی ہر وقت کی حضوری نصیب رہتی ہے۔

خلیل (قائل ہو کر) واقعی! تمہاری دلیلوں کا رد ممکن نہیں۔ میں آج کھانے کے بعد افتخار بھائی کے پاس جاؤں گا اور انہیں ساتھ لے کر حافظ رحیم الدین صاحب مخیر اخبار کے مالک سے مل کر گفتگو کروں گا۔

خلیل دس بجے دن کو کھانے سے فارغ ہو کر افتخار کے یہاں جانے

کے ارادے سے نکلا۔ چند قدم گیا تھا کہ ایک بے فکرے دوست سے ملاقات ہوگئی، صورت دیکھتے ہی جھاڑ کا کانٹا بن کر دامن گیر ہوگئے اور اپنے مکان لے جانے کا اصرار شروع کیا۔ خلیل نے ہر چند حیلے حوالے اور عذر معذرت سے ٹالنا چاہا مگر کوئی بات پذیرائی حاصل نہ کر سکی۔ ناچار جانا پڑا۔ گیا اور سارا دن قدیمی رنگ سے گذارا۔ شام کو دونوں دوست پارک کی تفریح کو گئے۔ یہاں ٹولی کے چند احباب اور بھی مل گئے۔ خلیل بچارے کی شامت آگئی، خوب خوب بنایا گیا۔ کسی نے زن مرید کا لقب عنایت کیا۔ کسی نے جورو کا غلام کہہ کر نوازا۔

ہر چند خلیل اس عامیانہ مذاق سے متنفر ہو چکا تھا اور احباب کی زبان سے ادا ہونے والے ہر جملے میں اپنی توہین مضمر پاتا تھا۔ عصمت النسا بیگم کا یہ قول نہ رد کر دل میں خلش پیدا کرنے کا باعث ہوتا تھا کہ "ان لوگوں میں تم مسخروں سے زیادہ وقیع نہیں"۔ عقیدت کی عینک اتارنے کے بعد حقیقت صاف منظر آنے لگی تھی، اور اس کا ضمیر بیوی کے قول کی تصدیق کر رہا تھا۔ اسے انتہائی قلق تھا کہ میں نے ناحق اتنے دنوں تک خاندانی وقار اور طبعی شرافت برباد کرنے میں بسر کی۔ کاش! دس روپے کی ملازمت پر دن گذارتا، اس میں بے وقعتی تو نہیں تھی۔ اُس نے اِس احساس کے ساتھ ہی صمیم قلب سے عہد کیا کہ آیندہ اس رکاکت سے گریز کروں گا اور جلد سے جلد اخبار کی ادارت قبول کر کے اپنے آپ کو علمی اور ادبی خدمت کا اہل ثابت کرنے کی کوشش

کروں گا۔ بیوی نے اب تک اس کی نسبت جتنی رائے ظاہر کی تھی، تجربے نے اسے صحیح ثابت کیا تھا۔ اس واسطے اس خیال میں بھی صداقت پوشیدہ نظر آتی تھی کہ تم کوشش کرو تو علمی جدوجہد میں بھی کامیاب ہو سکتے ہو۔ کوئی شبہ نہیں۔ کہ اس کے لکھے ہوئے بعض مضامین ملک میں پسندیدہ نظر سے دیکھے گئے تھے۔ اگر پورے انہماک سے کام لیا جائے تو اچھی ترقی کا امکان ہے۔

خلیل تو سرجھکائے چپ چاپ خیال میں غلطاں تھا اور چاروں جانب سے پھبتیوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ بعض ستم ظریفوں نے تو انہ صبری ہی کر دیا کہ اس کو سکوت کی مہر توڑ کر جواب دینے پر مجبور کرنا شروع کیا۔ وہ حیران تھا کہ ان بیباک دوستوں سے کیوں کر پنڈ چھڑانا چاہیئے، بات کچھ بنائے نہ بنتی تھی۔ ہر شخص اپنا اپنا راگ الاپ رہا تھا۔ آخر سوچتے سوچتے ایک فقرہ سمجھ میں آہی گیا اور اس نے ایک دولتمند کی طرف متوجہ ہو کر عرض کی۔ حضور! کیا گذارش کروں؟ شادی نے یونہی آزادی سلب کی تھی، طرفہ یہ کہ صحت نے بھی رفاقت سے منہ موڑ لیا۔ بیوی کا عرصہ گذرا کہ معدے نے اپنا فعل ترک کر دیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بات تک نہیں پچتا، زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ جن سرکاروں نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے مسلسل غیر حاضریوں کی بدولت وہ بھی موقوف کر دیئے۔ مختصر یہ ہے کہ طرح طرح کی پریشانیوں نے نرغہ کر لیا ہے۔ فکروں نے زندہ دلی اور خوش طبعی کافور کر دی۔ آج صبح حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے واسطے نکلا تھا، کہ شیخ نیضو

صاحب بل گئے ہیں۔ لاکھ لاکھ نرڑ ایڑیاں کیں مگر توبہ! بھلا یہ حضرت بھی کہیں چھوڑ سکتے تھے؟ گھسیٹ گھساٹ کے اپنے گھر لے گئے، دن بھر حوالات میں رکھا اس وقت تفریح کو نکلا"۔

امیر۔ کس حکیم کا علاج ہے؟

خلیل۔ حکیم عبدالباسط صاحب، چونکہ وہ میرے مزاج سے واقف ہو گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا نسخہ بہت جلد فائدہ کرتا ہے۔ رات تھنے پر تسکین ہو ڈال کر، اب دیکھئے! جہاں یہ وقت ہوا اور پیٹ میں درد ہونے لگا۔

امیر۔ واقعی! تمہیں سخت تکلیف ہے، اچھا جاؤ مگر کبھی کبھی چلے آیا کرو۔ بغیر تمہارے صحبت پھیکی رہتی ہے۔

خلیل۔ میں تو خود گھر میں پڑے پڑے پریشان ہو جاتا ہوں، لیکن مجبوری کا دوسرا نام شکر ہے۔ حضور حکم دیتے ہیں تو جس طرح بنے گا گرتا پڑتا حاضر ہوں گا۔

خلیل پارک سے نکل کر سید ما افتخار کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ پارک سے آگے بڑھ کے ٹانگہ کرایہ کیا۔ گھر کے دروازے پر دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ افتخار تین بجے سہ پہر سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ وہاں سے لیے خلیل سلام اپنے گھر واپس پہنچا۔ مکان میں قدم رکھتے ہی حکیم عبدالباسط کو موجود پایا۔ ان کے پاس ہی افتخار بھی سر جھکائے بیٹھا تھا۔

وہ نہایت متشوش ہُوا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ دل ہی دل میں غور کرتا ہوا اٹھا۔ حکیم صاحب سے صاحب سلامت کی اور ان کے پاس بیٹھ کر آہستہ سے پوچھا "بھائی افتخار! یہ کیا معاملہ ہے؟ صبح تو میں سب کو اچھا بھلا چھوڑ کر تمہارے یہاں جانے کے واسطے نکلا تھا۔ اتفاقاً شیخ فیصو سے ملاقات ہوگئی وہ مجھے کھینچ تان کر اپنے مکان لے گئے، بڑی مشکل سے ابھی انہوں نے چھوڑا تو سیدھا تمہارے مکان پہنچا لیکن تم موجود نہ تھے، ناچار گھر لوٹا۔ یہاں آیا تو یہ ملاحظہ پایا! خیریت تو ہے؟"

افتخار: بعض ذاتی کاموں کی بنا پر میں کبھی دفتر نہیں جا سکا، درخواست بھیج کر چار روز کی رخصت لے لی، تین بجے گھر سے نکلا۔ کئی روز سے تمہارے یہاں نہیں آیا تھا، دل لگا ہوا تھا، اس لئے پہلے اسی طرف کا رخ کیا۔ گھر میں داخل ہو کر دیکھا، بہن گردے کے درد سے مچھلی کی طرح پھڑک رہی ہیں۔ سراسیمہ ہو کے گھر سے نکلا۔ اتفاق سے جناب حکیم صاحب قبلہ اسی محلے میں کسی مریض کا معائنہ فرما رہے تھے۔ فٹنس پہچان کر کنارے کھڑا ہو گیا۔ جب حکیم صاحب مکان جانے کے لئے باہر تشریف لائے تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کیفیت عرض کی۔ حکیم صاحب فی الفور یہاں تشریف لائے مریضہ کو ملاحظہ فرمایا۔ نسخہ لکھا جو عطار کی دکان گیا ہے پیٹ اندر مالش کرنے کی دوا ہے، سینک بھی تجویز کی ہے۔

خلیل: دوا لینے کون گیا ہے؟

افتخار: کہین کا لڑکا۔

اتنی دیر میں نسخہ بندھ کر آ گیا۔ حکیم صاحب نے سب دوائیاں ملاحظہ فرمائیں، ان کے استعمال کی ترکیب بتائی اور چند ضروری ہدایتیں فرما کے رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد خلیل نے اپنے ہاتھ سے دوائیں جوش کیں حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق چھان بنا کر عصمت النسا بیگم کے پاس لایا۔ کافی زرسینہ تک پہنچ جانے کی وجہ سے اس کے درد میں کمی ہو گئی تھی۔ اس نے دوا پینے سے قطعی انکار کر دیا۔ افتخار نے سمجھا بجھا کر پلانا چاہا مگر اس نے نہ مانا۔ انکار سے چڑ کر خلیل نے پوچھا

"آخر دوا نہ پینے کا سبب؟"

عصمت۔ میرا جی نہیں چاہتا۔

خلیل۔ کیوں؟

عصمت۔ اس میں بو آتی ہے۔

خلیل۔ ناک بند کر کے پی جاؤ۔

عصمت۔ کڑوی بھی ہو گی۔

خلیل (مسکرا کر) بھلا! دوا بھی میٹھی ہوتی ہے؟

عصمت (سنجیدگی سے) ایسے ہی عزت، دولت اور شہرت بھی محنت اور مشقت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ جیسے دوا کڑوی اور فائدہ میٹھا ہے۔ اسی طرح محنت تلخ اور انجام شیریں ہوتا ہے۔

خلیل (مطلب سمجھ کر) تم کو مبارک ہو کہ میں نے تمہارا مشورہ قبول کر لیا اور اس

ذلت بھائی افتخار کے پاس بھی ضرورت سے گیا تھا کہ ان کی سعی سے اپنے اوقات معزز اور پسندیدہ افعال میں بسر کرنے کی جستجو کروں اور لہو و لعب کی زندگی سے کنارہ کش ہو جاؤں۔

عصمت (دعا کی کر) آج کا دن تو گذر گیا۔ مگر کل سویرے ہی تم بھائی افتخار کے ساتھ حافظ رحیم الدین سے مل کر ان کے اخبار کی ادارت منظور کر لو۔

خلیل۔ (غیر ارادی طور پر) اتنا جلد!

عصمت۔ ہاں کیا اب بھی عذر باقی ہے؟

خلیل۔ عذر تو کوئی نہیں لیکن تمہاری علالت کا خیال ہے۔

عصمت۔ میرا خیال چھوڑ دو میں صبح تک بالکل تندرست ہو جاؤں گی۔

خلیل صبح کو افتخار کے ساتھ حافظ رحیم الدین سے علاوہ بڑے اخلاق سے پیش آئے مطلب کی گفتگو تو افتخار ہی کے اشارے سے پہلے ہی طے کر چکا تھا صرف چارج لینا تھا۔ رضامندی کا اظہار ہوتے ہی دفتر کی کنجیاں اس کے حوالے کر دی گئیں۔

خلیل کی زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا اس نے ایسی عمدگی اور سلیقے سے اخبار کا کام جاری کیا کہ دو مہینے کی مختصر مدت میں اخبار کی اشاعت تین گنی زیادہ ہو گئی۔ عامۃ الناس کو اس کے مضمونوں سے خاص دلچسپی ہوتی تھی۔ جہاں

جہاں اخبار پہنچتا خلیل کی مضمون نویسی شہرت پذیر ہوتی جاتی۔ رفتہ رفتہ مُختیٰر
ہندوستان کی حدیں عبور کر کے بیرونی ملکوں میں بھی پہنچنے لگی۔

ایک دن خلیل نے شراب کی سرخی قائم کر کے ایک آرٹیکل لکھا۔ اُس میں
اُم الخبائث کے نقصانوں اور مضرتوں پر ظریفانہ انداز سے روشنی ڈالی۔ مضمون
چھپا اور ملک کے گوشہ گوشہ میں جا پہنچا۔ پبلک نے پڑھا اور اپنے اپنے احساس
کے موافق اثر پذیر ہوئی۔ بعض طبائع نے تائید اور بعض نے تردید کی۔ لیکن
اشتعال قبول کرنے والے وہ امیرزادے تھے جو شراب کو زینتی کی جان سمجھ کر
استعمال کرتے تھے۔ ان کے کان شراب کی ہجو کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اول
تو خلیل کی بڑھتی ہوئی شہرت کانٹے کی طرح آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔
اس پر طرّہ مزاج کے مخالف مضمون کی اشاعت غصّے کا مُنہ بحر ناڈگری پر پہنچ
گیا۔ ایک صاحب تو اتنے غضبناک ہوئے کہ اخبار ہاتھ میں لئے نشہ کی ترنگ میں
جھومتے جھامتے دفتر میں جا دھمکے۔ طرفہ تماشا یہ کہ نام سننے کے سوا اب تک
خلیل کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ دفتر میں داخل ہو کر خلیل سے پوچھا۔ اخبار کا ایڈیٹر
کہاں ہے؟

خلیل ان کے بگڑے تیور دیکھ کر معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ ایک تو فطرتاً
تیز طبع تھا اس پر نیت غضب کے شیدائی کی اکڑ والی گفتگو غمازی کر رہی تھی۔ وہ
فی الفور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا: "جناب تشریف رکھیں، ایڈیٹر صاحب ایک

ضرورت سے سطیع تک گئے ہیں۔ ابھی واپس آجائیں گے۔ اگر زیادہ تعجیل ہو تو خادم جاکر بلا لائے!

غترابی۔ اچھا میں بیٹھتا ہوں۔ آج بدمعاش کو گستاخی کا مزہ چکھائے بغیر نہ جاؤں گا۔ تم جاکر اسے فوراً بھیج دو۔

"بہت خوب" کہہ کر خلیل دل ہی دل میں مسکراتا ہوا دفتر سے باہر نکل گیا۔ اتفاقاً ایک اور صاحب دخترِ ور کی مذمت نگاری کا قصاص دیا چاہتے ہوئے جان کر ایڈیٹر کی گوشمالی کو لڑکھڑاتے ہوئے آپہنچے۔ دروازے ہی پر خلیل سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنی شکایت پیش کی۔ خلیل نے اتفاق کرتے ہوئے غصہ کی آنچ تیز کی اور جب ایڈیٹر کو دریافت کیا گیا تو شوخی کی راہ سے آفس روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں شرابی نواب زادہ کرسی پر بیٹھا ایڈیٹر کا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار کھلا ہوا میز پر رکھا تھا اور آنکھیں جگر سوز مطالعہ میں مصروف تھیں کہ دوسرے بگڑے دل شرابی صاحب داخل ہوئے۔ اور قصاص کی دھن میں آ کر دیکھا نہ تاؤ کرسی نشین کو ایڈیٹر سمجھ کر ہلا تھپ تھپ۔ نواب زادہ بھی انتقام کے جوش میں ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا اٹھا اور ایڈیٹر کے دھوکے میں دست و گریبان ہو گیا۔

خلیل نے باہر سے لڑائی کا تماشہ دیکھا اور مسکراتا ہوا قریب کے تھانے میں پہنچ کر واقعہ کی رپورٹ کی۔ اُسی وقت پولیس موقعہ پر آئی اور دونوں نبرد آزماؤں کو رسن بستہ کر کے تھانے لے گئی۔ ہاتی دن اور ایک رات حوالات میں بسر ہوئی

دوسرے دن باقاعدہ چالان ہوا۔ عدالت نے قانونی دفعہ کے مطابق فیصلہ کر کے دونوں کے سروں سے انتقامی بھوت دفع کر دیا۔

کایا پلٹ

کوئی تین چار برس کی بات ہے دارا نے آٹھواں درجہ پاس کر کے تعلیمی سلسلہ قطع کر دیا۔ وہ زندہ دل، ظرافت پسند اور آزاد مزاج واقع ہوا تھا۔ احباب کی دلچسپ صحبتوں میں ہنسنا ہنسانا صبح سے پیر رات تک بازاروں کی گشت لگانا اس کی زندگی کا واحد مشغلہ تھا۔ وہ خوش باشی اور خوش پوشی کو دل سے پسند کرتا تھا۔ اس کی ذاتی آمدنی کچھ نہ تھی۔ اس کے والد بھی مختاری کے ذریعہ سے واجبی ہی واجبی پیدا کرتے تھے جو دارا کے امیرانہ مصارف کو کافی نہ تھا تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس کی ظاہری وضع قطع اور ٹیپ ٹاپ کسی شوقین دولتمند سے کم نہ تھی۔

اس کے وقت کا بیشتر حصہ ایک مختصر سے چائے خانے میں گذر جاتا

تھا۔ جہاں صبح و شام مختلف طبقوں کے بے فکرے چائے نوشی کے ساتھ ساتھ اپنے مذاق و خیال کی مناسبت سے گپ شپ کیا کرتے تھے۔ یوں تو ہوٹل میں سینکڑوں موضوعوں پر بحث و تبصرہ ہوا کرتا تھا۔ مثلاً اٹلی و حبشہ کی جنگ، چین و جاپان کا معرکہ، فلسطین کے انسانیت سوز مظالم، اسپین کی خانہ جنگی۔ اسلامی ممالک کے انقلابی رجحانات یا ہندوستان کی سیاسی جدوجہد وغیرہ وغیرہ مگر ان سب سے دل پذیر اور مرغوب وہ موضوع ہوتے تھے۔ جو مرغ بازی، بٹیر بازی یا کبوتر بازی سے تعلق رکھتے تھے۔ جاڑوں کی رت میں کنکوے بازی کا اہم موضوع بھی شریک ہو جاتا تھا جسے لکھنؤ اور دہلی کے شوقین مزاجوں نے منظم کر دیا تھا لیکن اسی چائے خانے میں ایک طبقہ نوجوان وثیقہ داروں کا بھی موجود تھا جو وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک یا نادان محل روڈ کی اس خوبصورت مخلوق کو محبوب ترین موضوع قرار دیتا تھا جس نے اپنے حسن کی کارگزاری سے دوسروں کی جائدادوں و املاک پر دوہاجنوں کو قبضہ دلا کر ان کی بدنصیب اولاد کو محروم الارث کر دیا ہے۔

دارا اسی موضوع کا شیدائی تھا۔ اس کے احباب ہمیشہ کسی نہ کسی "مس" یا "بی جان" کا تذکرہ کرتے دکھائی دیتے تھے اور دارا کا جوشِ خروش نیز وسیع معلومات اسے احباب کی سطح سے بلند کر کے سالار بنا دیتی تھی۔

رفتہ رفتہ ایک ایسا زمانہ آگیا کہ چند فساد پسند و فتنہ جو دماغوں نے

شہری فضا کو مکدر کرنے، امن عامہ میں خلل ڈالنے اور شہرت و منفعت کے ساتھ سیاسی اقتدار جمانے کو نئے نئے ڈھونگ رچانا شروع کئے۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان جدید تحریکوں سے کیسے کیسے ہولناک نتائج برآمد ہوئے۔ وہ واقعات ہندوستان کے بچے بچے کو معلوم ہیں۔ البتہ ان حادثات کے ظہور پذیر ہونے سے چلائے خانے کے ہمہ دان ممبروں کے لئے بحث و مباحثہ یا خیال آرائی کرنے کو ایک جدید میدان ہاتھ آگیا اور زیادہ تر اسی میں وقت صرف ہونے لگا۔

یہی اضطراب انگیز زمانہ تھا کہ مجھے ضرورتاً لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے پردیس جانے کا اتفاق ہوا۔ اور اتنے عرصہ تک شہر سے غیر حاضر رہنا پڑا جس کی توقع نہ تھی ؛

؛ ایسی پر شہر کی حالت بد سے بدتر نظر آئی دفعہ ۱۴۴ اور کرفیو آرڈر کے نفاذ نیز نامسعود سیاسی کشمکش نے مزدور طبقے ہی کو ہلاک نہیں کیا۔ بلکہ اس کے مسموم اثرات سے متوسط طبقہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اتنا ہونے پر بھی شہر کے پرجوش سپوتوں کی آنکھیں نہ کھل سکیں جہاں حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑی اور لنگڑے، لولے، اپاہج، بے کاروں نے موقع و محل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گلی کوچوں میں خلاف قانون نعرے بلند کرنا شروع کر دئے۔ یہ طریقے

جنگ، جو طبائع پر بار ہوں یا نہ ہوں۔ مگر امن پسندوں کے لئے تباہ کن ضرور ثابت ہوئے۔

ان حالات کا لازمی نتیجہ ان انجمنوں کی صورت میں برآمد ہوا جو شہر میں کثرت سے قائم ہو گئیں۔ بعض تو محض وقتی اقتضا سے وجود میں آئیں اور چند ایسی بھی تھیں جو حقیقۃً درد لے کر ظاہر ہوئی تھیں اور اپنے سوئے ہوئے غریب بھائیوں کو ہر ممکن کوشش سے جگا کر زندہ قوموں کے بہدوش کرنا اور غفلت و کثرت کے اثرات کو مٹانا چاہتی تھیں

ہر چند ان انجمنوں کو منصۂ شہود پر آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ مگر ان کے سرگرم کارکنوں نے اس قلیل مدت میں ان بیکاروں کو باکار بنانے میں وہ کارہائے نمایاں کئے تھے جو معجزہ کہے جانے کے قابل تھے۔

اتوار کا دن تھا۔ شہر کی فضا بظاہر سکون پذیر تھی کہ ایک تنظیمی انجمن کی طرف سے جلسہ کا اعلان گوش گذار ہوا۔ انجمن کا نام بالکل نیا تھا۔ گو اس میں کشش ضرور تھی۔ اگرچہ اب سے پہلے بھی کچھ انجمنیں بہترین مقاصد لے کر عالم وجود میں آئیں اور چند روز گرما گرمی دکھا کر فنا ہو گئیں مگر لکھنؤ کے بے خبر اور نام نہاد امیرزادوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ البتہ انہیں کے اٹھے ولے اور چائے خانوں کے مدبروں میں چند روز کے لئے دو چار مسائل زیر بحث آ گئے

اور بس!

گمان تھا کہ موجودہ انجمن بھی اسی ہانڈی کا ابال ہو گی۔ صرف اس لئے منادی کی آواز پر کوئی توجہ نہ کی اور بات آئی گئی ہو گی۔

اسی روز شام کو رفیقی صاحب سے ملاقات ہو گئی، موصوف ایک دردمند دل و دماغ کے مالک ہیں۔ علمی و ادبی دنیا میں ان کی شہرت و بزرگی ہر قسم کی تعریف و تعارف سے بے نیاز ہے مجھے عرصہ سے ان کی نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ رفیقی صاحب اپنی وسیع الاخلاقی کی بنا پر اس نیاز مند کو دوستی کا درجہ دینے میں توقف نہیں کرتے۔ بہر کیف علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد انہوں نے دیر تک ملاقات نہ ہونے کی طویل شکایت کی۔ یہ شکایت بالکل حق بجانب تھی۔ اور میرا شہر سے غیر حاضر رہنے کا عذر معقولیت سے عاری تھا کیونکہ رفیقی صاحب کی بے انتہا عنایتوں کو دیکھتے ہوئے میرا فرض تھا کہ کم از کم ہفتہ میں ایک دفعہ ڈاک کے ذریعہ سے نیاز حاصل کرتا رہتا مگر اب شرمندہ ندامت ظاہر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اپنی غفلت تسلیم کرتے ہوئے اقبال جرم کر لیا۔

رفیقی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "جب آپ اپنی غفلت تسلیم کر چکے ہیں۔ تو اب اس کی تلافی ایک تفصیلی ملاقات ہی سے ہو سکتی ہے۔"

میں نے عرض کی: "میں یہ سزا بھگتنے کو بسر و چشم حاضر ہوں اور اگر

آپ اجازت دیں تو لگے ہاتھوں یہ بھی گذارش کر دوں کہ اس لطیف سزا کے بعد ارتکاب جرم کا شوق کچھ اور بھی افزوں ہو جائے گا۔

رفیقی صاحب نے متبسم ہو کر فرمایا۔ "تو ہر جرم کے بعد سزا کی نوعیت بھی بدلتی جائیگی۔"

مختصر تفریح کے بعد معلوم ہوا کہ رفیقی صاحب اسی جلسہ میں جا رہے ہیں۔ جس کا اعلان سنا گیا تھا۔

شاید ہم لوگوں کو تاخیر ہو گئی جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی اور مقرر ایک فتنہ پرور اخبار کے شر انگیز مضامین پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک ایسا مؤثر رزولیوشن پاس کرانے کی سعی کر رہا تھا جس کی رو سے حکومت کو اس امن سوز روش کی طرف توجہ دلائی جا سکے مجمع بہت کافی تھا۔ تخمینہ کرنے والوں کا خیال ہے کہ کسی طرح تین ہزار سے کم نہیں ہو سکتا تھا جن شرکا کو بیٹھنے کو جگہ نہیں ملی تھی وہ صف در صف کھڑے ہوئے قلبی ذوق شوق کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

رفیقی صاحب کو انجمن کی طرف سے مخصوص طریقے سے مدعو کیا گیا تھا اس لیے جلسہ کے منتظموں نے انہیں دیکھتے ہی کسی نہ کسی طرح راستہ نکال کر اسٹیج تک پہنچا دیا۔ میں بھی گرد کی طرح ان کے دامن سے لپٹا ہوا اس پلیٹ فارم تک جا پہنچا۔ جہاں انجمن کے روح رواں کرسیوں پر رونق افروز تھے۔

اور ان کے نصیح البیان مقررین پر جوش و دلولہ خیز تقریریں کر رہے تھے۔

یہاں جو عجیب چیز نظر آئی وہ میرا بھولا ہوا دوست دارا تھا جو سر سے پاؤں تک گاندھی جی کے فرمان کی تعمیل بنا ہوا ایک کرسی پر فرو کش اپنے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھا۔ اس کے سر پر کھدر کی ٹوپی گلے میں کھدر کا کرتا اور پاؤں میں کھدر کا پائجامہ تھا۔ سامنے چھوٹی میز پر ضروری کاغذات اور دوات رکھی تھی۔ ہاتھ میں قلم تھا اور صدر صاحب کو بار بار کاغذات اٹھا کر دیتا اور کچھ نوٹ کرتا جاتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ سا پیدا ہو گیا۔ میرا دل اس حقیقت کو حقیقت باور کرنے سے قاصر تھا۔ اگر غلو نہ متصور ہو تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ کئی بار ہتھیلیوں سے آنکھیں مل مل کے بغور دارا کی طرف دیکھا صرف اس لئے کہ معلوم کر سکوں کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ اصلیت ہے یا دھوکا۔

اس واقعہ نے اتنا متاثر کیا کہ میں کھو سا گیا۔ اگرچہ جلسہ میں بہت سے مفید ریزولیوشن پاس ہوئے بہترین تجویزیں پیش کی گئیں اور اگر اس قدر تعمیری امور زیر بحث لائے گئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں کچھ سن نہ سکا۔ صرف اس ایک گتھی کو سلجھانے میں جلسہ کا سارا وقت ختم کر دیا۔

تقریباً آٹھ بجے شب کو جلسہ برخاست ہوا۔ عوام الناس اثر پذیر دل لئے ہوئے واپس ہوئے۔ اتفاق سے رفیقی صاحب کو ایک ضرورت پیش آگئی اور وہ مجھ سے دوسرے روز مکان آنے کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئے اور مجھے دارا سے

تفصیلی گفتگو کرنے کا موقعہ حاصل ہو گیا۔ وہ تمام کاغذات سمیٹ کر اس خوبصورت موٹر کار کی طرف بڑھ رہا تھا جو اسے اور صدر صاحب کو جلسہ گاہ تک لائی تھی کہ میں نے راستے ہی میں جا لیا اور اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "دارا! کیا سچ مچ تم ہی دارا ہو اور کیا میری آنکھیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں؟"

دارا نے پشت کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر جو پانوں کی لالی سے یاقوت کی طرح سرخ ہو رہے تھے ہلکی ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ساتھ ہی یہ الفاظ گوش زد ہوئے "کیوں ——— کیا میرے چہرے پر وہ گھاس جم آئی ہے جس کے جھنڈوں میں شیاطین گھونسلہ بناتے ہیں یا جیسے سانپ بوڑھی کی طرح استعمال کر کے ریاکار مولوی نما لوگ سادہ لوح پبلک کو فریب میں مبتلا کرتے اور بھائی سے بھائی کو لڑا کر شہری امن و عافیت کو تحس نحس کرتے ہوئے اپنی ہانڈیاں گرم کرتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "نہیں ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ بلکہ تمہارا یہ مقدس لباس جس کی قدر و منزلت پہلے ہی سے میرے دل میں جاگزین تھی اور جسے ہندوستان کا نجات دہندہ کہنا سراسر حق بجانب ہے۔ مجھے استعجاب کے سمندر میں غرق کیے دیتا ہے۔"

دارا نے قدیم عادت کے مطابق مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ تو حیرت کی

بات نہیں ہے۔ بلکہ مسرت کا موجب ہے۔ میرا خیال ہے کہ علی العموم تمام ہندوستانیوں کو کھدر پوش ہو جانے ہی سے ترقی کی راہ مل سکتی ہے۔"

میں نے اس خیال کی پرزور تائید کرتے ہوئے کہا "بیشک یہی بات ہے۔ میری آنکھیں بے چینی سے اس وقت کا انتظار کر رہی ہیں جب وہ اپنے ملکی بھائیوں کو کھدر میں ملبوس دیکھیں گی لیکن تم ——"

اس نے میرا کلام قطع کرتے ہوئے بیچ سے کہنا شروع کیا۔ "میں —— ہاں میں ایک آزاد مرد، خوش باش ملکی مسائل سے بے پروا، عشرت پرست اور نفس پرور انسان تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ سرے ہی سے ملکی مفاد کا احساس یا ملی درد کا جذبہ میرے قلب سے مفقود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میری غفلتوں نے تمام ان محسوسات اور ادراکات کو دل کی پنہائیوں میں مدفون کر رکھا تھا۔ جو فطرتاً ہر ہندوستانی میں ودیعت ہونا چاہیئے۔ اور اب موقع پاتے ہی وہ ابھر آئے ہیں ——"

ڈرائیور نے ہارن بجا کر اسے متوجہ کیا۔ وہ اس طرح چونک پڑا جیسے سوتے سوتے جاگا ہو۔ پھر میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا

"چلو، دفتر میں بیٹھ کے باتفصیل گفتگو ہوگی۔ صدر صاحب کو فی الفور مکان پہنچنا ہے۔"

انجمن کا دفتر ایک عالی شان کوٹھی کے بیرونی حصہ میں تھا۔ ضروری فرنیچر اور بجلی پنکھے سے آراستہ تھا۔ ایک کمرہ مشرقی طرز پہ سجایا گیا تھا۔ زمین کے فرش پر قالین بچھے تھے۔ بظاہر وہ ہم خیال احباب کی نشست گاہ معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا کمرہ مغربی انداز پہ آراستہ تھا۔ شاید یہ مجلس عاملہ کے کام آتا تھا۔ تیسرا کمرہ انجمن کے ممبر بنانے کو مخصوص تھا۔ اسی طرح ہر کام کے واسطے علیحدہ علیحدہ کمرے موجود تھے۔

دارا مجھے اس کمرے میں بٹھا کر جو مشرقی طرز پہ سجایا گیا تھا۔ چند منٹ میں واپس آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ اس کی غیبت میں میرا دماغ پھر اس تبدیلی کے اسباب و علل دریافت کرنے میں منہمک ہو گیا۔ نہ معلوم کتنی دیر تک خیالی دنیا کی سیر میں مصروف رہا اور نہ معلوم کب تک کھویا رہتا۔ لیکن دارا نے اس سلسلے کو یہ کہہ کر ختم کر دیا۔ "لو پان کھاؤ۔"

میں نے تھالی سے ایک گلوری اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "دارا! مجھے اس عجیب و غریب انقلاب پر اتنا تعجب ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ تم اس قسم کی تحریکوں کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ تمہاری گستاخانہ جسارت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ بڑے بڑے لیڈروں کو بھی ان کے تحقیر آمیز لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ ذرا ابھی بس و پیش نہیں کرتے تھے تمہاری زندگی لہو و لعب میں گھل مل کر شیر و شکر ہو چکی تھی ——— برا نہ مانو

تو یہ بھی کہہ دوں کہ تم اپنوں اور پرائیوں کی نگاہوں میں ایسے آوارہ ہو گئے تھے کہ جس کا سدھرنا ممکن نہ تھا۔ پھر کیا اسباب فراہم ہوئے کہ تم نے اس زندگی کو ترک کرتے ہوئے وہ راستہ اختیار کیا جس میں جفاکشی اور نفس کشی کے سوا کچھ نہیں ہے؟

دارا نے مسکرانے کے بعد سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا: "تم نے میرے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے حقیقت میں میری اخلاقی حالت اس سے بھی زیادہ دل پست ہو چکی تھی، لیکن کیا تم نے سنا نہیں کہ عروج کا زینہ پستی ہی سے شروع ہوتا ہے۔ ہر تخریب کے بعد تعمیر جاری ہوتی ہے۔ قوموں کا جمود اپنی آخری حد کو پہنچنے کے بعد بیداری کی لہریں پیدا کرتا ہے۔

میں نے جواب دیا: "تمہارا یہ کہنا درست ہے لیکن عالم اسباب میں کوئی واقعہ علت کے بغیر رونما نہیں ہوتا۔"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہے ہندوستان جس سیاسی دور سے گذر رہا ہے اس نے ہر قوم کو بیدار کر دیا ہے۔ مادرِ ہند کی آغوش میں سونے والی قومیں کروٹیں لے کر جاگنے لگی ہیں، ہر طرف تنظیم تنظیم کا شور بلند ہے۔ ہم کو بھی جاگنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے قلب میں بھی زندگی کی حرارت کام کرنے لگی ہے لیکن عرصۂ دراز تک معطل رہنے سے ہمارے عملی قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ ہمیں ایک ایسے نبّاض رہبر کی ضرورت ہے جو ہماری کمزوریاں دور کرنے کے

ساتھ ساتھ ترقی کی شاہراہ پر لگا دے۔ یہی باعث ہے کہ میں نے چند دردمندوں کی امداد حاصل کر کے اس انجمن کی تشکیل کی ہے جو خدا کے فضل سے بہت ہی مفید خدمتیں انجام دے رہی ہیں۔ ایک طرف تو وہ قومی وقار کو محفوظ و مامون رکھنے میں ساعی ہے جسے طاقتور اغیار سیاسی چالوں سے فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف شہری بیکاروں کو کام پر لگاتے ہوئے بدر سلطان بود کے تباہ کن غرور کو توڑنے میں مصروف ہے۔ تم چاہو تو بازاروں اور گلی کوچوں میں ان لوگوں کو خوانچہ اٹھا کر پھلکیاں، کابلی کچالو اور دہی بڑے بیچتے دیکھ سکتے ہو جن کے آباؤ اجداد ابھی لکھنؤ میں حکمرانی کرتے یا بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے ـــ شاید تم ہنسو گے لیکن یہ ہنسنے کا مقام نہیں، حوصلہ افزائی کی جگہ ہے۔ وہ اپنا سرمایہ ختم کر چکے ہیں۔ ان کو نسلاً بعد نسلٍ خرچ کرنے کی عادت ڈالی گئی۔ لیکن پیسہ پیدا کرنے کا ہنر کسی اللہ کے نیک بندے نے نہ سکھایا۔ ان کا تجربہ رسوا کن بازیوں کے دائرے سے باہر نہ نکل سکا۔ وہ افلاس کا شکار بن گئے۔ افلاس جملہ جرائم اور تمام بداخلاقیوں کا خالق ہے۔ ضروریاتِ زندگی نے ان کی عالی ظرفی کو گھن کی طرح کھا لیا۔

اب تم ہی انصاف سے کہو اس حالت میں وہ اوچھے پیشے اختیار نہ کریں تو اعلیٰ کام کرنے کے لئے سنہری روپہلی سکّے کہاں سے لائیں۔ بالفرض ان دو شعار ہی کا کوئی حل نکل بھی آئے تو اس مقابلے کے دور میں ان کی کامیابی کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے؟

یہاں تک وہ جوش و ... میں بہتا چلا گیا۔ پھر میری طرف مستفسرانہ نظر ڈالنے لگا۔ میں نے اس کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ دارا! ... سے عافیت اندیشانہ خیالات موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ اور پیشہ حبیب اللہ مثل مشہور ہے۔ آج جتنے بڑے بڑے تاجر ہیں وہ ادنیٰ تجارت ہی سے فروغ حاصل کر کے بڑے ہوئے ہیں۔ یورپ کی مثالوں سے قطع نظر کر کے دیکھو تو تمہارے لکھنؤ ہی میں کچھ ایسے لوگ ملیں گے جو انیند ایپ ٹین کی پٹاری گلے میں لٹکا کر مال بیچا کرتے تھے اور آج ان کے فلک بوس محلات کھڑے ہیں، تعلقہ ہے اور ہر طرح کی عزت و حرمت نصیب ہے۔"

دارا نے ساتھ جوش کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ ہاں ہاں! میں ایسے متعدد نام گنوا سکتا ہوں۔ بہر نوع اسی تخیل کے ماتحت میں نے یہ تنظیمی انجمن قائم کی ہے۔ اس کا سالانہ چندہ صرف پانچ آنے مقرر ہے تاکہ غریب پبلک گرانی محسوس نہ کرے۔ اب تک کئی ہزار ممبر بن چکے ہیں لیکن میں ان کی تعداد دس ہزار سے بھی متجاوز کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی انجمن کے ممبروں کو تین جماعتوں میں تقسیم کرنا طے کیا ہے (۱) بچہ (۲) جوان (۳) بوڑھے۔ اور سن و سال کے لحاظ سے ان کے فرائض تجویز کیے ہیں۔ ورزش کو لازم کر دیا ہے۔ کیونکہ افلاس و تنگدستی نے ہماری قوم کی جسمانی صحت کو گھن کی طرح کھا لیا ہے۔

گھڑی نے دس بجا دیے اور میں اس سے رخصت حاصل کرنے کا پہلو

تلاش کرنے لگا، مگر اس کا جوش سمندر کے جھاگ کے مانند ابل رہا تھا۔ وہ اپنی تمام مفید اور زریں سکیموں کو وضاحت سے بیان کرنا چاہتا تھا جن سے اس کی طبیعت ان کاموں کی طرف راغب ہوئی تھی، اس نے کھانا، پینا اور سونا حرام کر لیا تھا جب تک وہ مجبور نہ کیا جاتا تھا کام سے ہاتھ نہ روکتا تھا۔ اس کے احباب دفتر ہی میں کھانے کی سینی لا دیتے تھے اور وہ تعجیل دو چار لقمہ کھا کر معدہ کی اشتہا فرو کر لیتا تھا۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی کام نہ رہنے کے باعث بستر پر آرام کرنا میسر آتا ہو۔ ورنہ اکثر و بیشتر دفتر ہی میں اونگھ لینے کو کافی تصور کرتا تھا۔

اس نے مجھے جمائیاں لیتے اور آنکھیں ملتے دیکھ کر کہا۔ "تم میری باتوں سے اکتا گئے ہو لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لوگ اسی طرح اکتا جاتے ہیں مگر میرے دل میں جو آگ روشن ہو چکی ہے وہ ایک ساعت کبھی سوزش سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ میں شاہ امان اللہ خان کی طرح فی الفور اپنے بھائیوں کو زندہ قوموں کے دوش بدوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "دارا! کئی روز کی مسلسل شب بیداری نے مجھے بے انتہا کسل مند کر دیا ہے اور سویرے ہی ایک ضرورت سے کانپور جانا ہے تاہم میری جستجو کا ذوق تشنہ ہے میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے مزاج کی تبدیلی کن واقعات کے اثر سے واقع ہوئی ہے؟"

دارا نے چند لمحہ سکوت کر کے کہا "خیر! اس وقت میں بقیہ حالات کو آئندہ ملاقات پر موقوف رکھتے ہوئے صرف ایک واقعہ بیان کروں گا اور یہی تمہارے سوال کا حقیقی جواب ہوگا۔ غالباً یہ حقیقت تو آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ہندوستان میں ہماری قوم مفلسی اور بدحالی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اور کون ایسا فرد ہے جو کبھی نہ کبھی اس الم ریز تخیل سے دردمند نہ ہو جاتا ہو۔ میں بھی باوجود گوناگوں دلچسپیوں کے گاہے ماہے اس سوال پر سرسری نظر ڈال لیا کرتا تھا۔ اس وقت میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھنے لگتی تھی۔ مگر اُسے برقی چشمک کی طرح قیام نصیب نہ ہوتا تھا۔ تھوڑے دن کی بات ہے کہ میں چائے خانے میں بیٹھا تھا۔ ایک اٹھائیس تیس سال کی شکستہ حال فقیرنی نے سامنے آ کر سوال کیا۔ میں نے نے کمال بے پروائی سے "معاف کرو" کہا اور سیگریٹ کا لچھے دار دھواں چھوڑنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ فقیرنی بدستور اپنی جگہ کھڑی رہی۔ معلوم کیوں ——— کس جذبہ کے ماتحت، مگر میں نے اس سے سوال کیا "کیا تم ملازمت کر کے پیٹ نہیں پال سکتیں؟ آخر بھیک مانگنے میں کیا لذت ہے جو خواہ مخواہ بھلے آدمیوں کو پریشان کرتی پھرتی ہو؟"

اس نے دل خراش انداز سے جواب دیا "نوکری ملتی ہی نہیں۔ دو چار جگہ ماماؤں میں ملازمت کرنا چاہی مگر چور آوارہ کہہ کر دھتکار دی گئی"۔

میں نے پوچھا "تمہارا خاوند کیا کرتا ہے۔ کیا وہ تمہیں روٹی کپڑا نہیں دے سکتا؟"

اب عورت سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کی آنکھوں سے جلتے جلتے آنسو ٹپک پڑے جنہیں اس نے کثیف اور رجا بجا سے پھٹے ہوئے دوپٹے کے آنچل میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب! خاوند ہی جیتا ہوتا تو بھیک کیوں مانگتی؟"

میں نے پوچھا "وہ کب فوت ہوا؟"

اس نے روتے ہوئے جواب دیا "چھ مہینے ہوئے۔ وہ ریل کے کارخانے میں رنگ سازی کرتے تھے۔ بڑے مزے سے بسر گذر ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک گاڑی پر پینٹ ڈال رہے تھے۔ معلوم کیا ہوا کہ برابر والی پٹڑی پر جانے والے انجن کے نیچے جا پڑے۔ پہیہ اوپر سے چل گیا اور وہ کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے حاکموں کو عرضی دینے کی رائے دی اور میں نے عرضی دینا بھی چاہی لیکن غریب اور عورت ذات ہونے کے باعث میری عرضی وہاں تک نہ جا سکی۔ بیچارے کا ایک بچہ گود میں تھا۔ آئے دن اکارہ گئی، جو کچھ مایہ پونجی تھی اس کی دوا دارو میں صرف ہو گئی۔ تین فاقوں کے بعد جب مردار حال ہو جاتی ہے معصوم بچے کی خاطر بھیک مانگنے لگی۔ ہر روز شہر آتی ہوں اور دن بھر میں جو کچھ ملتا ہے اسے لے کر واپس چلی جاتی ہوں۔"

اس کے دردانگیز و رقت خیز بیان نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ "میں تمہیں ریلوے کمپنی سے گزارہ دلوانے کی کوشش کروں گا اور جب تک تم کو گزارہ نہ ملے گا اپنے یہاں ماما کی جگہ دے دوں گا۔"

وہ اس ملازمت پر خوشی خوشی آمادہ ہو گئی۔ میں نے جیب سے پونی نکال کر اس کے حوالے کی کہ "آج تو کھانے پینے کا انتظام کر لو۔ کل صبح نو بجے کو لے کر یہاں آ جانا۔ میں اسی چائے خانے میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

وہ شاد شاد دعائیں دیتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ابر گھر آیا۔ ہواؤں نے طوفانی صورت اختیار کر لی۔ دھواں دھار بارش شروع ہو گئی۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نے مجبور کیا کہ میں کوچہ گردی کی بجائے گھر ہی میں بیٹھا رہوں۔

رات میں جتنی مرتبہ آنکھ کھلی اس مصیبت زدہ فقیرنی کا خیال دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا محسوس ہوا۔ "خدا نے عالم باغ تک پہنچنے میں دکھیاری پر مصیبت کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے؟"

دوسرے دن صبح چھ بجے بارش تھم چکی تھی۔ راستے کیچڑ پانی میں لتھڑے پڑے تھے لیکن مجھے فقیرنی کے خیال نے گھر میں بیٹھنے نہ دیا اور وعدے کے مطابق چائے خانے میں آ گیا۔ وقت گذرتا گیا اور میری امید مایوسی سے بدلتی گئی۔ بارہ بجے مکان آ کر کھانا کھایا۔ خدا جانے کیوں بار بار فقیرنی کا خیال تڑپا دیتا تھا۔

وہ رات بھی کٹ گئی۔ واقعہ کی تیسری صبح ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ سامنے سے ایک اخبار فروش گذرا۔ میں نے اسے آواز دے کر زنانہ اخبار خریدا اور لوکل خبریں پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ یکایک عالم باغ میں ایک عورت کی لاش دستیاب ہونے کی اطلاع نے چونکا دیا۔ میں نے بغور وہ خبر پڑھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ

پولیس کو ایک عورت کی لاش نالہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کے کپڑوں سے ایک جونی بھی برآمد ہوئی ہے۔ مزید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ایک فقیرنی شہر سے بھیک مانگ کر چند فقیروں کے ساتھ اپنی جھونپڑی کی جانب واپس ہو رہی تھی۔ راستے میں بادوباراں کے طوفان نے آگھیرا۔ سب فقیر گنجان درختوں کے سائے میں پناہ گزیں ہو گئے لیکن متوفیہ نے اپنا سفر ملتوی نہیں کیا۔ حالانکہ اس کے ساتھیوں نے روکنے کی بہت کچھ سعی کی لیکن اس نے اپنے بیمار بچے کے پاس جسے جھونپڑی میں چھوڑ آئی تھی اور وہ بالکل تنہا تھا پہنچ جانے کے لیئے ان کے ساتھ ٹھہر کر بارش ختم ہونے کا انتظار کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ پر آب نالے کو عبور کرتے ہوئے پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ نکلی اور پل کی جالی میں پھنس کر ہلاک ہو گئی۔

آہ! یہ وہی بدنصیب عورت تھی میں نے کالج میں اس کی لاش دیکھ کر اپنے خیال کی تصدیق کر لی اور رہی کے بعد سے اپنے غافل بھائیوں کو بیدار کرنے کا عہد کر لیا کیونکہ وہ بھی میری ہی قوم کی ایک فرد تھی۔

اس سے زیادہ المناک واقعہ یہ پیش آیا کہ اس کا علیل بچہ بھی دودھ کے بغیر پھڑک پھڑک کے جاں بحق ہو گیا۔"

یہ واقعات اتنے حسرت آموز اور عبرت ناک تھے۔ کہ میں دیر تک ان پر حسرت کے آنسو بہاتا رہا۔ پھر دارا کو اس کی خیانت کے جوش نہ

خروش پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے چندہ دے کر انجمن کی ممبری قبول کر لی اور سائر پذیر دل لئے ہوئے رخصت ہو کر مکان آگیا:

(مطبوعہ انڈین پرنٹنگ ورکس: کچہری روڈ لاہور)